اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

جون ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۶، جون ۲۰۱۸ء / رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

مشمولات

تعلیم، تحقیق، تربیت، تزکیۂ نفس

O تعلیم و تربیت

- تعلیم کے اسلامی معیارات اور چیک لِسٹ — مدیر — ۴
- قوم کی اخلاقی تعلیم و تربیت کون کرے گا؟ — ملک احمد سرور — ۱۵
- یادِ ماضی ۔ پہلے استاد کیسے ہوتے تھے؟ — پروفیسر ابو مجاہد — ۱۷

O دینی مدارس

- ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت — مولانا مفتی تقی عثمانی — ۲۰
- دینی تعلیم کے مختلف پہلو — مولانا محمد یاسین ظفر — ۲۸
- دینی مدارس 'نیا تعلیمی نظام' خود کیوں قائم نہیں کرتے؟ — مدیر — ۳۲
- یوم مزدور اور علماء کرام کا معاوضہ — پروفیسر عاصم حفیظ — ۳۶

اسلام، پاکستان اور مغرب

O فہم دین

- رمضان المبارک میں حصولِ تقویٰ — محمد خاں منہاس — ۳۸
- دینی جدوجہد اور تقسیمِ کار — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی — ۴۱

O اسلام اور پاکستان

- خوئے غلامی — ڈاکٹر محمد امین — ۴۵
- جمہوریت اور اسلامی نظام — پروفیسر ملک محمد حسین — ۴۶
- انتخابات ۲۰۱۸ء — پروفیسر طارق بٹ — ۵۱
- دینی سیاسی جدوجہد کا صحیح طریق کار — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵۴

O دریچے

- پڑھتا جا شرماتا جا — نقیبِ سحر — ۵۵

البرہان آن لائن مطالعہ کیجیے: www.al-burhan.com

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

Islamic Standards of Education (ISE) and Check list

تعلیم کے اسلامی معیارات اور چیک لسٹ

کیا آپ کا سکول/تعلیمی ادارہ اسلامی ہے؟

❁ ’تحریک اصلاحِ تعلیم‘ چونکہ برسوں سے اسلامی تناظر میں نظام تعلیم کی اصلاح کے لیے کام کررہی ہے اس لیے کئی لوگ جو سکول چلا رہے ہیں یا سکول کھولنا چاہتے ہیں ہم سے رابطہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے سکول میں کیا ایسے اقدامات کریں کہ ان کا سکول اسلامی تقاضے پورے کرنے لگے اور اسے ایک اسلامی سکول کہا جاسکے۔ تعلیم کے اسلامی ہونے کے موضوع پر ہم نے کئی کتابیں لکھی ہیں خصوصاً ’ایک اسلامی سکول کے خدوخال‘ اور تربیت پر ہماری دو کتابیں اس موضوع پر براہ راست روشنی ڈالتی ہیں۔ تاہم آج کی نشست میں ہم تعلیم کے اسلامی معیارات (Islamic Standards) کی ایک فہرست مرتب کرنا چاہتے ہیں جو ایک لحاظ سے چیک لسٹ بھی ہوگی تا کہ ان معیارات اور چیک لسٹ کو سامنے رکھ کر سکول چلانے والا یا نیا سکول کھولنے والا ہر شخص یہ دیکھ سکے کہ کیا اس کا سکول ان اسلامی تقاضوں کو پورا کررہا ہے؟

❁ ان معیارات میں ہم نے اگرچہ سکولوں کو مخاطب کیا ہے اور جگہ جگہ لفظ ’سکول‘ استعمال کیا ہے لیکن اس سے مراد جدید تعلیم کا ہر ادارہ ہے۔ خواہ وہ سکول ہو، کالج ہو یا یونیورسٹی (دینی مدارس کے لیے البتہ الگ معیارات اور چیک لسٹ کی ضرورت ہے)۔ اسی طرح بالعموم ’طلبہ‘ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جب کہ ہمارے پیش نظر طلبہ وطالبات دونوں ہیں۔ اسی طرح پرنسپل و استاد سے مراد خواتین و مرد دونوں طرح کے اساتذہ اور پرنسپلز ہیں۔

❁ ان معیارات کا ماخذ یا اصل الاصول کیا ہے؟ یعنی وہ کون سے پالیسی یا بنیادی اصول (Fundamental Principles) ہیں جن سے یہ معیارات اخذ کیے گئے ہیں اور جن پر یہ معیارات مبنی ہیں؟ یہ معیارات تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں: ۱۔ ہماری تعلیم اسلامی تعلیمات وروایات کے مطابق ہونی چاہیے۔ ۲۔ ہماری تعلیم مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اور

اس کے تعلیمی اصولوں پر مبنی نہیں ہونی چاہیے۔ ۳۔تعلیم کی ثنویت (Dichotomy) کا اصول غیر اسلامی ہے۔

ہم ان تین اصولوں پر اپنی کتابوں میں اور البرہان کے مضامین میں بار بار روشنی ڈال چکے ہیں اس لیے جن اصحاب کو ان اصولوں کے اسلامی ہونے میں اشکال ہو وہ ہمارے لٹریچر کا مطالعہ فرمائیں۔ یہاں ہم تفصیل دے نہیں سکتے اور اگر ہم نے اختصار سے لکھا تو وہ مخلِ فہم ہو گا اور فائدہ مند نہ ہو گا۔

❁ نظام تعلیم مختلف اجزاء کا نام ہے جیسے سکول انتظامیہ، استاد، نصاب، طلبہ، نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں، سکول کا ماحول وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک جزء کو اسلامی تناظر میں مدون کرنے سے کام نہیں چلے گا اور نہ اچھے نتائج پیدا ہوں گے۔ اس لیے ان سارے اجزاء پر اسلامی تناظر میں عمل ضروری ہے اور ان سب کے لیے اسلامی معیارات کا تعین ضروری ہے۔

❁ ممکن ہے شعبۂ تعلیم سے متعلق کئی لوگ ہمارے ان ’معیارات‘ سے متفق نہ ہوں یا ان ’معیارات‘ کے ’بنیادی اصولوں‘ کو وہ مختلف فیہ (اختلافی) سمجھتے ہوں۔

بلاشبہ اسلامی تعلیمات کے فہم میں بعض اوقات اختلافِ فکر و نظر کی گنجائش ہوتی ہے لیکن اس وقت ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کی ملحدانہ غالب تہذیب ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے اور جو لوگ اسلامی تعلیمات و روایات پر عمل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی کر نہیں پاتے اور فکری، تہذیبی، معاشرتی اور معاشی دباؤ ان کو مغرب کی تہذیبی و تعلیمی روایات سے مفاہمت (Compromises) پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسے وقت، ہماری رائے میں صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ اس مفاہمت کو نظریہ و فلسفہ بنا کر (یعنی Philosophize کر کے) درست ثابت کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ بہتر ایمانی رویہ یہ ہے کہ اپنی خامی کو تسلیم کر کے یہ کہا جائے کہ میں اس دینی حکم پر اس وقت عمل نہیں کر سکتا۔

اس کی روزمرہ کی مثال یہ ہے کہ آپ عادۃً نماز نہیں پڑھتے لیکن کوئی ساتھی آپ سے کہتا ہے کہ آؤ نماز پڑھیں، تو آپ کو چاہیے کہ کوئی عذر کر دیں کہ میرے کپڑے پاک نہیں، میں گھر جا کر پڑھ لوں گا یا اس وقت مجھے ایمرجنسی میں فلاں جگہ پہنچنا ہے.... بجائے یہ کہنے کے کہ

''میں نماز نہیں پڑھوں گا، تمہیں کیا؟ میری مرضی!'' کیونکہ ایسا کہنا اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے جو بحیثیت عبد آپ کو زیب نہیں دیتی اور بحیثیت مسلمان آپ کے ایمان کے منافی ہے۔ مطلب یہ کہ ان تعلیمی معیارات کو جھٹلانے یا غلط کہنے یا اختلافی کہہ کر ان سے جان چھڑانے کی بجائے یہ تسلیم کریں کہ ہونا تو ایسا ہی چاہیے لیکن ہم فلاں فلاں عذر کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ مغربی فکر و تہذیب سے کس حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ یہ بحث بھی ہماری کتابوں میں کئی جگہ موجود ہے۔

ان تمہیدی کلمات اور وضاحتوں کے بعد آیئے اب نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے اسلامی معیارات کی طرف۔

انتظامیہ

۱۔ پرائیویٹ سیکٹر کی صورت میں سکول کا مالک/ ڈائریکٹر اور پبلک سیکٹر کی صورت میں تعلیمی ادارے کا سربراہ اور پرنسپل یہ نیت اور عزم کرے بلکہ اس کا اظہار واعلان کرے اور مناسب سمجھے تو یہ بات لکھ کر اپنے سامنے یا کسی ایسی جگہ رکھ لے جہاں اٹھتے بیٹھتے اس پر اس کی نظر پڑے کہ اس کے تعلیمی ادارے کا اور اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو اچھا مسلمان بنائے۔ تعلیمی ادارے کے پراسپکٹس میں اور اس کے مشن کے بیانیے (Mission Statement) میں اس مقصد کو بنیادی جگہ ملنی چاہیے بلکہ مناسب ہوگا کہ یہ بات سکول میں کسی نمایاں جگہ/ جگہوں پر لکھ دی جائے یا ہر کمرے میں لکھی ہو تا کہ ہر استاد اور ہر طالب علم کو مستحضر رہے۔

۲۔ اور بات صرف نیت اور عزم تک محدود نہ رہے بلکہ ڈائریکٹر/ پرنسپل اس کے لیے عملی اقدامات کرے یعنی اساتذہ کے انتخاب اور تربیت کے وقت، نصابی کتب کی تیاری اور انتخاب کے وقت، طلبہ کے داخلے اور تعلیم و تربیت کے دوران۔ نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں، منظم کرتے ہوئے اور بحیثیت مجموعی سکول کا ماحول ایسا رکھے جو اس مقصد میں مدد ومعاون ہو۔

۳۔ تعلیمی ادارے میں ہر سطح پر احتساب کا ایسا نظام ہو جو دیکھے، جائزہ لے اور نگرانی کرے کہ تعلیمی ادارے کا ڈائریکٹر/ پرنسپل بلکہ ہر متعلقہ فرد اس مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا نہیں؟ مثلاً اس غرض سے اساتذہ کا احتساب پرنسپل کرے، پرنسپل سے مالک/ ڈائیریکٹر پوچھے۔

وائس چانسلر سے چانسلر پوچھے یا سنڈیکیٹ/ بورڈ آف گورنرز اس کا جائزہ لے....وغیرہ۔

وضاحت

۱۔ اچھا مسلمان ہی اچھا انسان ہوتا ہے اور اچھا مسلمان وہ ہوتا ہے جس کا ماٹو بلکہ زندگی گزارنے کا لائحہ عمل یہ ہو کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہو اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہوتی ہے۔ دنیا میں کامیابی سے مراد یہ ہے کہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزاری جائے۔ تعلیم میں ملازمت یا کاروبار کی اہلیت ومہارت طلبہ میں پیدا کر دینا ہی کامیابی نہیں ہوتی، اگرچہ یہ بھی تعلیم کے مقاصد کا ایک جزو ہے۔

۲۔ اچھا مسلمان ہونے کا بہترین ماڈل پیارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ہے نہ کہ ہمارے معاشرے میں مروج محض چند مظاہرِ تقویٰ جیسے مردوں کا شلوار قمیص اور ٹوپی پہننا، داڑھی رکھنا....اور عورتوں کا حجاب ونقاب اوڑھنا وغیرہ۔

۳۔ اسلامی روایت میں تعلیم کاروبار نہیں ہے لیکن موجودہ حالات میں جب حکومت اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہی اور معاشرے کو بھی تعلیم کی پشت پر کھڑا نہیں کیا گیا تو پرائیویٹ تعلیمی ادارے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مجبوراً طلبہ سے فیس لے سکتے ہیں۔

نصاب

۱۔ قرآن حکیم کی تعلیم (صحیح مخارج کے ساتھ ناظرہ، مکمل ترجمۂ قرآن اور آخری پارہ و اہم سورتوں کا حفظ) ہر مسلمان طالب علم کے لیے لازمی ہونا چاہیے۔

۲۔ احادیث رسول وسیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیے۔

۳۔ بنیادی عقائد، عبادات، اخلاق، اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا علم اور ان کی اس طرح تدریس کہ ان پر عمل کا داعیہ پیدا ہو بلکہ طلبہ کو ان پر عمل کی پریکٹس کرائی جائے۔

۴۔ عمرانی علوم (Social Sciences) کی اس طرح تدریس کہ ان کا ایک حصہ قرآن وسنت کی محکم اور ناقابل تغیر نصوص پر مشتمل ہو اور دوسرا مبنی بر تازہ اجتہاد (کہ پرانے اجتہاد کے اکثر نکات وقت، مکان اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی Relevance کھو دیتے ہیں)۔

۵۔ سائنسی علوم کی اسلامی تناظر میں تدوینِ نو۔

نصابی کتب

۱۔ ایسی نصابی کتب کا انتخاب کرنا جو مذکورہ بالا خصوصیات کی حامل ہوں۔

۲۔ اگر ایسی کتب میسر نہ ہوں تو انہیں تیار اور مہیا کرنے کی فکر کرنا۔

۳۔ جب تک مذکورہ بالا خصوصیات کی کتب میسر نہ ہوں، وقتی طور پر

i۔ مذکورہ صفات کی ممکنہ حد تک حامل کتب کا انتخاب کیا جائے۔

ii۔ ان نصابی کتب میں مذکورہ حوالے سے خامیوں کی نشاندہی کرکے اپنے اساتذہ کے ذریعے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ سکول سطح پر (یعنی پری سکول سے بارھویں تک) غیر مسلموں اور غیر پاکستانیوں کی لکھی ہوئی اور غیر مسلم اداروں کی طبع کردہ کتابیں نہ پڑھائی جائیں اور نہ غیر ملکی اداروں سے امتحان دلوائے جائیں جیسے او اور اے لیول کے۔

لسانی پالیسی

۱۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو رد کرنا کہ یہ چیز نہ صرف مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی غلامیذہن میں مستحکم کرتی ہے بلکہ یہ انتہائی ضرر رساں، غیر عقلی، غیر سائنسی (Unscientific) اور غیر منطقی ہے کیونکہ زبانیں سیکھنے کا اصول یہ ہے کہ پہلے اپنی مادری/قومی زبان میں مہارت حاصل کرلی جائے اور ایک زبان کی مہارتوں پر بچوں کو قدرت حاصل ہوجائے تو پھر وہ دوسری (Secondary) زبان سیکھیں۔ چار سال کے بچے کو بیک وقت اردو، انگریزی اور عربی زبان سکھانا بے عقلی کی بات ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کمپیوٹر میں بیک وقت تین ایسے Software ڈال دیے جائیں جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوں اور پھر کمپیوٹر سے Output کی توقع بھی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر بچوں کو کسی زبان میں بھی مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ انگریزی ذریعہ تعلیم طلبہ کو رٹے (Rote Learning) کی عادی بناتی، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو کچلتی اور شرح خواندگی کو کم کرتی ہے کہ بہت سے طلبہ انگریزی میں کمزور ہونے کی وجہ سے فیل ہوجاتے ہیں اور تعلیم جاری نہیں رکھ پاتے۔

۲۔ سکول سطح پر انگریزی کی تدریس لازمی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اسے چھٹی جماعت سے اختیاری مضمون رکھا جا سکتا ہے ورنہ دنیا بھر میں دوسری زبانیں (Second Languages) عموماً یونیورسٹی سطح پر سکھائی جاتی ہیں نہ کہ سکول سطح پر۔

۳۔ پری سکول میں انگریزی بالکل نہیں پڑھائی جانی چاہیے بلکہ اردو قاعدے سے بھی پہلے طلبہ کو عربی کے حروفِ تہجی اور حروف والفاظ ملا کر پڑھنا سکھایا جائے تاکہ مسلمان بچوں کے قرآنی عربی کے مخارج درست ہو جائیں (اس کے لیے تجوید جاننے والے قاری کی خدمات حاصل کی جائیں یا آڈیو وڈیو کی مدد لی جائے)، پھر انہیں اردو (یا مقامی زبان) سکھائی جائے۔

۴۔ تیسری سے لے کر دسویں تک آسان انداز میں قرآنی عربی پڑھائی جائے جس میں عربی قواعد رٹنا شامل نہ ہو تاکہ مسلمان بچوں کو قرآن فہمی میں آسانی ہو نیز پڑھنے، سمجھنے کے علاوہ بولنے، سننے اور لکھنے (انشاء) کی مہارتیں بھی اس میں شامل ہوں۔

وضاحت

۱۔ جہاں حکومتی پالیسی ان نصابی معیارات کے خلاف ہو:

i۔ تو اس کی مخالفت کی جائے اور ہر پلیٹ فارم پر اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور اسے تبدیل کرانے کی کوشش کی جائے۔

ii۔ اس پالیسی کی وجہ سے پیدا ہونے والی خامیاں دور کرنے کے لیے انتظامیہ اور اساتذہ مل کر آسان زبان اور اسلامی تناظر کو ملحوظ رکھنے والی نصابی کتب تیار کریں یا مارکیٹ میں موجود کتب میں سے اس لحاظ سے مقابلتاً بہتر کتابوں کا انتخابات کر لیں۔

iii۔ ناقص اور غلط حکومتی پالیسی کے ضرر کو کم کرنے کے لیے دیگر اقدامات کیے جائیں۔

۲۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ان معیارات پر عمل کی پوری کوشش کی جائے۔

۳۔ غلط پالیسیوں سے کم سے کم مفاہمت (Compromise) کیا جائے۔

اساتذہ

۱۔ ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جو ذہین اور محنتی ہوں، طبعِ سلیم رکھتے ہوں اور کسی

مخصوص (فقہی، کلامی، سیاسی) مسلک کے متشدد پیروکار یا مبلغ نہ ہوں بلکہ معتدل مزاج، حلیم الطبع، شگفتہ مزاج اور'نوجون' ہوں تاکہ وہ تعمیری اثرات قبول کرسکیں۔

۲۔ سکول انتظامیہ ان اساتذہ کی خود تربیت کرے۔ نہ صرف ان کو طرق تدریس سکھائے بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کرے۔ ان کو یہ سکھائے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کیسے کریں۔ نفس کے تزکیے سے یہ مراد ہے کہ وہ بری عادات چھوڑ دیں اور تعمیری اخلاق اپنائیں، اسلامی تعلیمات خصوصاً اسلام کے اوامر ونواہی پر عمل کریں۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بڑھائیں اور جائز طریقوں سے دنیا میں بھی آگے بڑھیں اور آخرت میں بھی اعلیٰ درجات کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔

۳۔ اس کے بعد ان کو یہ بتایا جائے کہ ان کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ طلبہ کے نفوس کا تزکیہ کریں یعنی ان کی اچھی تربیت کریں، انہیں اچھا اور باعمل مسلمان بنائیں۔ انہیں دین کی ضروری تعلیم دیں اور اسلام کے اوامر ونواہی پر عمل کا خوگر بنائیں۔ ان کی صلاحیتوں کو بڑھانے اور پروان چڑھانے کی بھی کوشش کریں۔

ایک اچھا استاد، خواہ وہ کسی بھی مضمون کا استاد ہو، یہ کام کرسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اسے یہ احساس ہو کہ اس نے یہ کام کرنا ہے اور اسے یہ پتا ہو کہ یہ کام اسے کیسے کرنا ہے۔

اس غرض سے استاد کی تربیت سکول انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔ وہ سٹڈی سرکل منظم کرے، ہفتہ وار نشستیں رکھے، مربی ومزکی حضرات کو بلائے، گرمیوں کی چھٹیوں میں ورکشاپس رکھے.... غرض اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔

۴۔ استاد کو یہ سکھانا اور بتانا بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی تربیت کا یہ کام صرف محبت وشفقت سے کرسکتا ہے، جب وہ طلبہ میں یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوجائے کہ وہ ان کا خیر خواہ ہے، ان کا مستقبل اسے عزیز ہے اور وہ باپ کی طرح ان کے لیے شفیق ہے۔ پھر وہ نہ صرف اس کی بات سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے بلکہ وہ اس جیسا بننے کی کوشش بھی کریں گے۔

طلبہ

۱۔ طلبہ کو یہ احساس ہونا چاہیے اور والدین، پرنسپل واساتذہ کو انہیں یہ احساس دلانا

چاہیے کہ ان کی عمر چھوٹی ہے اور عقل وعلم تھوڑا ہے لہٰذا انہیں چاہیے کہ اساتذہ کی باتیں توجہ سے سنیں اور ان پر عمل کریں۔

۲۔ سکول انتظامیہ اور اساتذہ کو بچوں کے لیے Caring ہونا چاہیے اور انہیں ان کی ضروریات اور سہولتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ تدریسی عمل کو ان کے لیے دلچسپ بنانا چاہیے اور انہیں مار پیٹ اور سزا دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۳۔ نہ صرف طلبہ کی اسلامی خطوط پر تعلیم وتربیت سکول انتظامیہ اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے بلکہ وہ طلبہ جن کی بری عادتیں پختہ ہو چکی ہوں اور جن کے اخلاق بگڑ چکے ہوں، ان کی اصلاح بھی پرنسپل اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے ہر سکول میں ایک 'تربیت کمیٹی' بنی چاہیے جس کا ایک ناظم ہو اور جس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ طلبہ کی اسلامی خطوط پر تربیت کے لیے درکار اقدامات کا تعین کرے، ان پر عمل یقینی بنائے اور بگڑے طلبہ کی اصلاح کے لیے ماہرین نفسیات، ماہرین اخلاق اور والدین کی مدد سے ان کی اصلاح کے لیے منظم کوششیں کرے۔

۳۔ طلبہ کی تعلیم اور تربیت میں فرق کرنا چاہیے۔ تعلیم جاننے اور سیکھنے کا نام ہے جب کہ تربیت خوشی سے اس پر عمل کرنے کا۔ تربیت وتزکیہ کوئی غیر مرئی اور روحانی چیز نہیں ہیں بلکہ کرنے کا ایک کام ہے مثلاً استاد نے طلبہ کو بتایا کہ وضو کیسے کرتے ہیں؟ طلبہ نے سنا اور سبق یاد کرلیا کہ وضو اس طرح کرتے ہیں۔ یہ تعلیم ہے۔ تربیت یہ ہے کہ استاد طلبہ کے سامنے وضو کرے اور پھر ان میں سے ہر ایک سے وضو کرائے۔ اسی طرح نماز یاد کرا دینا کافی نہیں بلکہ طلبہ کے سامنے نماز ادا کی جائے اور ان سے نماز ادا کرائی جائے۔ پھر طلبہ کو نماز کے فائدے اور احکام بتائے جائیں اور ان کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا جائے کہ وہ شوق سے باقاعدہ نماز پڑھنے لگیں۔ اسی طرح صفائی پر سبق پڑھا دینا کافی نہیں بلکہ عملاً چیک کیا جائے کہ طلبہ کے کپڑے اور جوتے اور ان کی بنیان اور جرابیں صاف ہیں؟ کیا طلبہ روزانہ دانت صاف کر کے آتے ہیں؟ کیا وہ کاغذ وغیرہ کوڑے دان میں ڈالتے ہیں؟ اور پھر انہیں ان کاموں کے کرنے کی مستقل ترغیب دی جائے تاکہ وہ ان کی عادت بن جائیں۔

۴۔ بچوں میں اچھی عادتوں کی تعمیر اور بگڑے بچوں کی اصلاح کے لیے تشدد اور

مار پیٹ اکثر غیر مفید ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا تربیت کرنے والا استاد صبر اور برداشت سے کام لے اور نرمی و محبت سے بتدریج بچے کو بدلنے کی کوشش کرے۔

۵۔ پری سکول کا وہی تصور صحیح تھا جو ماضی میں ہمارے ہاں رائج تھا یعنی چھوٹے بچے کی تربیت والدین کرتے۔ ۶ سال کی عمر میں بچے کو پہلی جماعت میں داخل کرانے سے چھ مہینے یا سال پہلے بچے کو سکول بھیجنا شروع کر دیا جاتا تھا تاکہ وہ سکول جانے کے عمل سے مانوس ہو جائے۔ وہ ابتدائی لکھنا پڑھنا سیکھ لے، سو تک گنتی سیکھ لے تاکہ پہلی جماعت میں آسانی سے چل سکے۔ آج کل ہمارے ہاں جو پری پرائمری کو دو سال تک پھیلا دیا گیا ہے، اس کے لیے بھاری بھر بستہ بنا دیا گیا ہے اور پلے گروپ، نرسری اور پریپ کے نام سے تین باقاعدہ تعلیمی مراحل بنا دیے گئے ہیں، یہ سب مغرب کی اندھی نقالی کی وجہ سے ہے۔ اہل مغرب کی مجبوری یہ تھی کہ باپ کے ساتھ ماں بھی گھر پہ نہیں ہوتی، ملازمت کرتی ہے اور نہ گھر میں دادا دادی ہوتے ہیں تو بچے کو کون سنبھالے اور کون اس کی تربیت کرے؟ لیکن ہمارے ہاں تو مائیں گھر پہ ہوتی ہیں، وہ بچوں کی تربیت کیوں نہ کریں؟

بہر حال اگر پری سکول کی موجودہ روش ہماری 'مجبوری' بن ہی گئی ہے (یعنی مغرب نے بنا دی ہے) تو بھی ہمیں اتنا تو کرنا ہی چاہیے کہ بچے پر کتابوں کا بوجھ کم رکھیں اور زیادہ تر کام ایسی تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے ہو جو اسلامی اقدار پر مبنی ہوں اور جنہیں استاد کھیل کے دوران اور دلچسپ انداز میں سکھائے۔ نیز بچے پر تین زبانیں بیک وقت سیکھنے کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

نصابی و ہم نصابی سرگرمیاں

۱۔ نصابی سرگرمیوں کے بارے میں اوپر بات ہوگئی کہ تعلیم، عمل سکھانے والی (Action Oriented) ہو اور اسے عملی سرگرمیوں پر مبنی (Activity Based) ہونی چاہیے۔

۲۔ ہم نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں پر بھی سطور بالا میں مذکور ہمارے دو اصولوں کا اطلاق ہونا چاہیے یعنی ایک تو ان کا تناظر اسلامی ہونا چاہیے اور دوسرے وہ مغرب زدہ نہ ہوں اور مغربی اقدار سکھانے والی نہ ہوں۔ اس کے لیے چار قاعدے وضع کیے جا سکتے ہیں:

i۔ اسلامی موضوعات پر سرگرمیاں منعقد کی جائیں جیسے پندرہ شعبان کو ’’یوم استقبال رمضان‘‘ منانا اور یوم بدر، یوم معراج وغیرہ اور ان مواقع پر موضوع کے حوالے سے ساری کلاسوں میں خصوصی لیکچرز دیئے جائیں، اساتذہ کو تیاری کروائی جائے اور انہیں مواد مہیا کیا جائے۔

ii۔ ہمارے ہاں مذہبی وقومی تقریبات پر چھٹی کرنے کا رجحان عام ہے جو اصولاً غلط ہے مثلاً یوم اقبال یا یوم پاکستان پر چھٹی کرنے کی بجائے بچے سکول آئیں اور اقبال کی زندگی اور پیغام کو اسلامی تناظر میں بچوں کے سامنے رکھا جائے۔اسی طرح یوم پاکستان پر چھٹی کرنے کی بجائے طلبہ کو پاکستان کی تحریک، دوقومی نظریے اور قیام پاکستان کے اسلامی مقاصد سے آگاہ کیا جائے۔

iii۔ اگر چھٹی کرنا ضروری ہو جیسے عیدین کے موقع پر، تو چھٹیوں سے پہلے آخری دن عید کے موضوع پر ہر کلاس میں گفتگو ہونی چاہیے اور اس کے اسلامی پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہیے مثلاً یہ کہ عید الفطر اس لیے خوشی کا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان شریف کے روزے رکھنے اور رات میں قیام (تراویح پڑھنے) کی سعادت بخشی۔ اور عید الاضحیٰ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے....وغیرہ۔

iv۔ طلبہ کو تقریبات کے انعقاد میں اور انتظامات میں عملاً شریک کیا جائے تا کہ ان میں تنظیمی صلاحیتیں ابھریں اور ان میں کاموں کی منصوبہ بندی اور ان پر عمل درآمد (Planning & Implementation) کا رویہ پروان چڑھے۔

سکول کا ماحول

سکول کے ماحول کو اسلامی بنانے کے لیے بھی اسلامی تناظر اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے ردّ کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے جیسے:

ا۔ طلبہ کے لیے مغربی لباس لازمی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ بھی مغربی تہذیب کی بالادستی کو قبول کرنے اور اس سے مرعوبیت کا مظہر ہے۔اس کی بجائے مقامی لباس پہنا جائے اور اسے حقیر نہ سمجھا جائے۔طالبات کو بچپن سے سکارف لینے کی عادت ڈالی جائے اور ننگے سر

رہنے یا وی (V) کی پٹی لٹکانے کی عادت نہ ڈالی جائے۔

۲۔ خواتین اساتذہ کے لیے بھی ڈریس کوڈ ہونا چاہیے یعنی وہ بھی ننگے سر، بال کٹوا کر یا دوپٹہ گلے میں ڈال کر یا ایک کندھے پر لٹکا کر سکول نہ آئیں۔ خواتین اساتذہ چونکہ طالبات کے لیے رول ماڈل ہوتی ہیں اس لیے انہیں غیر ضروری فیشن کرنے (لپ سٹک اور کاجل لگانا، بھنویں بنوانا وغیرہ) اور چست وتنگ لباس پہننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۳۔ مرد اور خواتین اساتذہ کا اختلاط بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اساتذہ یا تو سارے مرد ہوں یا ساری عورتیں۔ بوائز سکول میں خواتین اساتذہ نہیں ہونی چاہئیں اور گرلز سکول میں مرد اساتذہ اور سٹاف نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ طلبہ وطالبات کا اختلاط بھی نہیں ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی بہن بھائیوں کو دس سال کی عمر تک اکٹھے سونے (دوسرے لفظوں میں اختلاط، بے تکلفی، کھیل کود وغیرہ) کی اجازت دی ہے۔ اس سے بعض اہل سکول اپنے مالی مفاد کی خاطر تیسری یا پانچویں جماعت تک مخلوط تعلیم کی گنجائش نکالتے ہیں لیکن انہیں دو چیزیں سمجھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اجازت سگے بہن بھائیوں کے لیے ہے نہ کہ عام بچوں کے لیے۔ دوم آج جو فتنہ کا زمانہ ہے۔ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا نے بچوں کو بہت سی جنسی معلومات قبل از وقت دے دی ہیں، ماحول اخلاق باختگی کا ہے۔ مجرموں کو سخت سزائیں نہیں ملتیں اور چار چار سال کی بچیوں کا ریپ ہو رہا ہے۔ ایسے میں بہتر ہے کہ پرائمری میں بھی مخلوط تعلیم سے بچا جائے اور لڑکوں لڑکیوں کے سکول الگ الگ بنائے جائیں اور ان کے اساتذہ بھی اسی صنف کے ہوں۔

چیک لسٹ

ہر سکول کا ڈائریکٹر یا پرنسپل مذکورہ بالا 'تعلیم کے اسلامی معیارات' پر اپنے ادارے کو پرکھ سکتا ہے۔ نظامِ تعلیم کے چھ اجزاء (سکول انتظامیہ، استاد، نصاب، طالب علم، نصابی وہم نصابی سرگرمیاں اور سکول کا ماحول) کے بارے میں ہم نے جو 'معیارات' وضع کیے ہیں، وہ واضح ہیں اور ان معیارات پر اپنے ادارے کو پرکھنا بہت آسان ہے۔ امید ہے کہ ان معیارات اور چیک لسٹ سے سکول تعلیم کو مطابق اسلام بنانے میں مدد ملے گی۔

ملک احمد سرور [۱]

تعلیم و تربیت

قوم کی اخلاقی تعلیم و تربیت کون کرے گا؟

معاشرے پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو قوم اس وقت اخلاقی انحطاط کا شکار ہے۔ دھوکا، فریب، کام چوری اور محنت سے گریز، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، نوسر بازی، وعدہ شکنی، بے حسی اور خود غرضی، رشوت و کرپشن، اسراف اور نمود و نمائش، بخل، تکبر و غرور، جعل سازی، بدمعاشی، عریانی و فحاشی، دوسروں کی تذلیل و حقارت کرنا، ظلم و ناانصافی، جھوٹ، غیبت، دولت کی بنیاد پر وجود میں آنے والا طبقاتی امتیاز غرضیکہ ہر بدی اپنی انتہا پر نظر آتی ہے۔ سڑکوں پر نظم و ضبط کے بجائے ایک افراتفری کا عالم ہے اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ حادثات کو بڑھاتی جارہی ہے۔ کار والا موٹر سائیکل والے کو اور موٹر سائیکل والا پیدل کو انسان ہی تصور نہیں کرتا، جانور کو تو وہ سڑک پار کرنے کا حق دیتا ہے مگر پیدل انسان کو نہیں۔ سڑکوں گلیوں میں جہاں جس کو موقع ملتا ہے گند پھینکتا ہے، پان تھوکتا ہے اور حاجات ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے گھر کا گند دوسرے کے گھر کے سامنے پھینکنے کی بیماری میں ہر دوسرا تیسرا فرد مبتلا ہے۔ سپیکر (ڈیک) پر اونچی آواز میں گانے، قوالیاں، تلاوت اور نہ سننے والوں کو تقریریں سنوانا تو کارِ ثواب سمجھا جارہا ہے حالانکہ مریضوں، حساس طبیعت کے افراد اور طلبہ و طالبات کے لیے یہ ایک اذیت ناک عذاب ہوتا ہے۔ اپنی باری کے انتظار میں قطار میں لگنے کی روایت تو اب ختم ہو چکی ہے۔ غریب افراد فاقوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کی نوبت تک بھی پہنچ جائیں، کسی رشتے دار کو خبر ہوتی ہے نہ ہمسائے کو۔ چند دہائیاں قبل گلی محلے کے بزرگ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ علاقے کے کسی لڑکے کو غلط بات کرتے یا کام کرتے دیکھتا تو نرم و سخت ہر طریقے سے اس کی اصلاح کرسکتا تھا مگر اب کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی چھوٹے بچے کو بھی ڈانٹ سکے (سکولوں میں یہ حق اساتذہ سے بھی چھین لیا گیا ہے)۔ اگر کوئی کم تول رہا ہے، ملاوٹ کررہا ہے، گالم گلوچ کررہا ہے یا کسی اور غلط کام میں ملوث ہے تو کوئی اسے سمجھانے کی غلطی نہیں کرے گا کہ سب جانتے ہیں کہ کوئی کسی کی بات سننے کو تیار نہیں کیونکہ ہر فرد خود کو بڑا

---

[۱] مدیر ماہنامہ ’چشم بیدار‘ لاہور

علامہ بلکہ سقراط سے بھی بڑا سمجھتا ہے۔تو پھر یہ اصلاح کا کام کیسے ہو؟ قوم کی اخلاقی تربیت کا فریضہ کون ادا کرے؟

اصلاحِ معاشرہ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری ویسے تو ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے مگر تین گروہوں پر یہ کچھ زیادہ عائد ہوتی ہے۔ سب سے بڑی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ قوم کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کرے مگر جب حکمران کرپٹ، جھوٹے، خائن، معاہدہ شکن اور جرائم کے خوگر ہوں، جعل سازی کا تحفظ کرتے ہوں اور جھوٹ بولنے کو معیوب نہ سمجھتے ہوں تو وہ کیونکر اس فرض کو ادا کریں گے؟ پاکستان میں اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ حکمران طبقہ معاشرتی برائیوں میں لتھڑا ہوا ہے اور عوام اس کی تقلید کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ جس پر اصلاحِ معاشرہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، علمائے کرام کا ہے۔ بدقسمتی سے اثرورسوخ رکھنے والے علماء کی اکثریت بھی حکمرانوں سے مختلف نہیں۔ بیشتر علماء فرقہ وارت کی بیماری میں مبتلا ہیں، ان کا ہر خطبہ اور تقریر دوسرے فرقے کی لعن طعن پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔ لوگوں کو برائیوں کے خلاف نہیں بلکہ فرقہ واریت کی متعصب دیواروں کو اونچا کرنے کے لیے مشتعل کیا جاتا ہے۔ بہت کم علماء امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضے کو ادا کر رہے ہیں۔ تیسرا گروہ اساتذہ کا ہے، نسل نو کی تعلیم و تربیت جس کی ذمہ داری ہے۔ مگر افسوس کہ یہ گروہ بھی مادیت کے سیلاب میں بہہ چکا ہے، وہ نوکری برائے تنخواہ کرتا ہے برائے تعلیم و تربیت نہیں۔ اگر مذکورہ تین گروہ اپنے اپنے فرائض کو ادا کرتے تو آج معاشرہ اخلاقی طور پر اس انحطاط کا شکار نہ ہوتا بلکہ اس کا اخلاقی معیار بہت بلند ہوتا۔ سیاستدانوں اور حکمرانوں کو تو ''اخلاقیات'' کی طرف متوجہ کیا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ اخلاقیات کو وہ اپنی ''کامیاب سیاست'' کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور ان کی ساری سیاست جھوٹ اور مکروفریب کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ روشن خیال دانشوروں اور صحافیوں کا ایک بڑا طبقہ بھی ''اخلاقیات'' کے معاملے میں سیاستدانوں کا ہم نوا ہے۔ صرف علماء اور اساتذہ رہ جاتے ہیں جن کے اندر خوفِ خدا رکھنے والے افراد بھی پائے جاتے ہیں، ہماری انہی سے گزارش ہے کہ وہ مل بیٹھیں اور کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کریں کہ اس معاشرے کو مزید انحطاط سے بچایا جاسکے۔ (بشکریہ 'چشم بیدار' لاہور)

تعلیم و تربیت

پروفیسر ابو مجاہد

پہلے استاد کیسے ہوتے تھے؟

یادِ ماضی

یہ غالباً 1927ء کے موسمِ سرما کی ایک چمکتے دن کی دو پہر تھی جب گورنمنٹ مڈل ماڈل سکول نلی ضلع شاہ پور میں ماسٹر کنہیالال ہیڈ ماسٹر تھے اور اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز (اے ڈی آئی) سکول کا سالانہ معائنہ کر رہے تھے۔ ساتویں جماعت کے لڑکوں کو ریاضی کا سوال دیا گیا کہ وہ حل کریں۔ بچے سوال حل کر کے اپنی اپنی سلیٹیں ہاتھ میں لیے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اے ڈی آئی صاحب سلیٹوں پر نگاہ ڈالتے اور غلط ہے، غلط ہے کہتے کہتے قطار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ قطار میں آخری سے تین طالب علم پہلے کھڑے لڑکے کی سلیٹ پر اُچٹتی نظر ڈالتے جب اے ڈی آئی صاحب نے کہا کہ غلط ہے تو لڑکے نے آہستہ آواز میں کہا کہ میرا سوال تو ٹھیک ہے۔ اس پر اے ڈی آئی صاحب خفا ہو کر ہیڈ ماسٹر صاحب کو بولے کہ کیسا گستاخ لڑکا ہے جو میرے سامنے بولتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر کنہیالال نے لجاجت سے کہا کہ لڑکا گستاخ نہیں ہے آپ ذرا ایک دفعہ پھر سلیٹ پر حل شدہ سوال دیکھ لیں۔ جناب اے ڈی آئی صاحب نے بادل نخواستہ جب دوبارہ سلیٹ پر نظر ڈالی تو حیرت زدہ رہ گئے کہ لڑکے کے سوال کا حل تو واقعی ٹھیک تھا۔ فراخ دلی سے لڑکے کو شاباش دی اور جیب سے ایک اٹھنی نکال کر اُسے انعام سے بھی نوازا۔ یہ لڑکا تھا عبداللہ خان جو بعد میں گورنمنٹ مڈل ماڈل سکول کٹھہ سگھرال تحصیل خوشاب ضلع شاہ پور میں اَن ٹرینڈ ٹیچر بھرتی ہو گیا جہاں پر اس کے استاد محترم ماسٹر کنہیالال ہیڈ ماسٹر تھے۔ عبداللہ خان، جو بعد میں قاضی عبداللہ کے نام سے مشہور ہوئے، ایک قابل اور محنتی ٹیچر ثابت ہوئے اور محکمہ تعلیم نے اُن کی کارکردگی اور معلمانہ مہارت کے پیش نظر جے۔ وی (جونیر ورنیکلر) کی اعزازی سند سے سرفراز کیا اور یوں وہ اَن ٹرینڈ ٹیچر سے ٹرینڈ ٹیچر بن گئے تھے۔

ریاضی کے مضمون میں اُن کی مہارت پورے علاقے میں مشہور تھی۔ ادبی تحریریں اور خوش خطی میں بھی وہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ سکول میں ایک قلمی رسالہ بھی ترتیب دیتے تھے جو شعر و ادب کا شاہکار ہوتا تھا۔ گورنمنٹ مڈل ماڈل سکول کٹھہ سگرال میں انہوں

نے 16 سال تدریسی ملازمت کی اور صرف 34 سال کی عمر میں 1948ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُس زمانے میں مڈل سکول کے استاد کی تنخواہ 15 روپے کے لگ بھگ ہوتی تھی لیکن اُن کی وسعت قلبی کا یہ حال تھا کہ دو تین نادار طالب علم اُن کی زیر کفالت رہتے۔ آٹھویں جماعت کے طلبا کو امتحان کی خصوصی تیاری کے لیے رات کو اپنے گھر بلا کر آدھی آدھی رات تک تیاری کراتے۔ لالٹین میں تیل اپنی گرہ سے ڈالتے اور طلبہ کو بغیر کسی لالچ یا معاوضہ کے پڑھاتے بلکہ بعض اوقات کھانا بھی کھلاتے۔ ان کے شاگرد اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی اولاد سے پیار کا رشتہ برقرار رکھے رہے۔ اُن کا بیٹا ایک عجیب واقعہ سناتا ہے کہ" میں جب صرف سات سال کا تھا کہ ایک شام نیم تاریکی میں اپنے گاؤں کی گلی میں جا رہا تھا۔ پیچھے ایک صاحب جو اُس گاؤں کے نہیں تھے آ رہے تھے۔ اُن صاحب نے مجھے پکار کر کہا کہ بچے ٹھہرو میری بات سنو۔ میں ٹھہر گیا تو وہ صاحب کہنے لگے کہ تم کہیں میرے استاد کے بیٹے تو نہیں ہو؟ مَیں نے پوچھا آپ کے کون سے استاد؟ تو اُن صاحب نے کہا کہ قاضی عبداللہ جو مڈل سکول کٹھہ سگھر ال میں دس سال پہلے میرے استاد تھے۔ میں نے کہا کہ ہاں میں اُن کا بیٹا ہوں، تو وہ صاحب کہنے لگے کہ میں نے تمہاری ٹور (چال) سے پہچانا کہ تمہاری ٹور بالکل میرے استاد صاحب کی طرح کی تھی۔ وہ صاحب ہمارے گاؤں میں پٹواری کے طور پر تبدیل ہو کر آئے تھے اور ان کے آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ زمین کی وراثت کے انتقال وغیرہ انہوں نے مکمل کرا دیے۔" اس واقعہ کا تفصیلی ذکر اس لیے کیا کہ ایک شاگرد کی اپنے استاد کے ساتھ اتنی والہانہ محبت کہ دس سال تک اُسے اپنے استاد کی ٹور (چال) یاد تھی جو اُس نے ان کے بیٹے کی ٹور (چال) سے شناخت کر لی۔ ایسی بات گہرے تعلق اور والہانہ محبت کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔

ایک استاد کی صلاحیت، کارکردگی اور محنت کا طرۂ امتیاز اس وقت سامنے آیا جب غالباً پندرہ سولہ سال پہلے ایک تعلیمی سیمینار میں ایک معروف ماہر تعلیم نے ذکر کیا کہ ہم نے اپنے سکول کے دنوں میں جو کتابیں پڑھی ہیں اُن کا کوئی موازنہ اب دستیاب درسی کتب سے ایسا ہے جیسا کہ سورج کو چراغ دکھانا۔ موصوف نے آٹھویں میں پڑھی ریاضی کی درسی کتاب کا خصوصی ذکر کیا جو ماسٹر کنہیالال اور عبداللہ خان (قاضی عبداللہ) نے مل کر لکھی تھی جو شاید اب تک دستیاب ریاضی کی کتب میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ یاد رہے ماسٹر کنہیالال اور قاضی عبداللہ یا عبداللہ خان دونوں کی تعلیم صرف مڈل تک یعنی آٹھویں جماعت تک تھی اور ان

دونوں حضرات نے چھٹی سے آٹھویں تک ریاضی کی درسی کتب کا سیٹ تصنیف کیا تھا۔ ماسٹر کنہالال پاکستان بننے کے بعد بھارت چلے گئے اور شاید دہلی میں ادبی کاموں میں مصروف رہے۔

تقسیم برصغیر پاک وہند سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک اساتذہ کے اپنے پیشے کے ساتھ پُرخلوص تعلق، اپنے شاگردوں کے لیے جاں فشانی، اپنے کام کی مہارت اور بے غرض خدمت کی سینکڑوں ہزاروں لازوال داستانیں ہیں جنہیں اگر بیان کیا جائے تو لائبریریاں بھر سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال چوہدری سردار احمد، سابق آئی جی پولیس نے اپنی کتاب جہانِ حیرت میں بیان کی ہے۔ اُن کے استادِ محترم کا نام ماسٹر غلام قادر تھا جو سکول اوقات کے بعد بھی اپنے شاگردوں کو اپنے گھر پر پڑھایا کرتے تھے۔ چوہدری سردار لکھتے ہیں کہ " ایک دن چھٹی کے بعد بعد دوپہر ہم استادِ محترم ماسٹر غلام قادر کے گھر پڑھنے جا رہے تھے کہ ہم نے کچھ لوگ قبرستان سے واپس آتے دیکھے۔ پتہ چلا کہ ماسٹر غلام قادر کی بیٹی فوت ہوگئی ہے اور لوگ اُسے قبرستان میں دفن کر کے واپس آ رہے ہیں۔ ہم یہ جان کر خوش ہوئے کہ چلو آج تو چھٹی ہوگی اور پڑھنا نہیں پڑے گا۔ ہم واپس جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ماسٹر غلام قادر قریب آ گئے اور انہوں نے حکم دیا کہ چلو بیٹھ کر پڑھنا پڑھانا شروع کرتے ہیں۔ ہماری خوشی پر اوس پڑ گئی اور سر جھکا کر ساتھ چل دیے۔ جب ہم پڑھ رہے تھے تو ماسٹر غلام قادر کے چچا پاس سے گزرے اور کہا: غلام قادر آج تمہاری بیٹی فوت ہوئی ہے آج تو چھٹی کر لیتے۔ ماسٹر غلام قادر بولے ''چچا! اُسی مرحومہ بیٹی کے ایصال ثواب کے لیے تو ان بچوں کو پڑھا رہا ہوں''۔ یہ تھا پاکستان کے اولین سالوں کے اساتذہ کرام کا جذبۂ خدمت اور احساس ذمہ داری! اور اب بدلا ایسا زمانہ کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے۔ اور یہ یونہی نہیں ہوگیا۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ استاد کو وہ عزت، وہ وقار، وہ مقام اور وہ حیثیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ جب پٹواری نے بھی وراثت کے انتقال کے لیے استاد سے پیسے طلب کیے اور جب تھانیدار، تحصیل دار اور ڈپٹی کمشنر نے بھی اپنے فرائض کا معاوضہ مانگا اور جب اکاؤنٹ آفس کے بابوؤں نے بھی استاد سے ہر کام کی رشوت طلب کی تو استاد کو بھی عزت، وقار، شاگردوں کی محبت اور احترام کی ضرورت نہیں، اب وہ بھی معاشرے کے چلن کے عین مطابق حلال اور حرام کے تصور سے ماورا صرف اور صرف پیسے کی زبان میں بات کرتا ہے اور اگر کوئی اس سے پوچھے کہ پڑھاتے کیوں نہیں ہو؟ تو کہتا ہے کہ مجھے تنخواہ ہی کتنی ملتی ہے کہ پڑھاؤں۔ اس تنخواہ میں تو میرا صرف سکول میں آنا بنتا ہے پڑھانا تو اس میں شامل نہیں۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی[۱]

دینی مدارس

ایک نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت

مجھے اپنے والد مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے سنی گئی اس بات کو کئی جگہ سنانے کی توفیق ہوئی۔ پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں تین بڑے نظامِ تعلیم معروف تھے: ایک دارالعلوم دیو بند کا نظامِ تعلیم، دوسرا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا نظامِ تعلیم اور تیسرے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نظامِ تعلیم۔

حضرت والد ماجدؒ نے تقریباً 1950ء میں ایک موقع پر جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات فرمائی تھی: ''پاکستان بننے کے بعد درحقیقت نہ ہمیں علیگڑھ کی ضرورت ہے، نہ ندوہ کی ضرورت ہے، نہ دارالعلوم دیو بند کی ضرورت ہے، بلکہ ہمیں ایک تیسرے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے اَسلاف کی تاریخ سے مربوط چلا آرہا ہے۔''

بظاہر سننے والوں کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی تھی کہ دارالعلوم دیو بند کا ایک مستند مفتیٔ اعظم اور دارالعلوم دیو بند کا ایک سپوت یہ کہے کہ ہمیں پاکستان میں دیو بند کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمیں ایک نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے۔

حضرت والد ماجدؒ نے جو بات فرمائی وہ درحقیقت ایک بہت گہری بات ہے اور اُسی کے نہ سمجھنے کے نتیجے میں ہمارے ہاں بڑی عظیم غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں جو تین نظامِ تعلیم جاری تھے، وہ درحقیقت فطری نہیں تھے، بلکہ انگریز کے لائے ہوئے نظام کا ایک نتیجہ اور انگریز کی لائی ہوئی سازشوں کا ایک ردّعمل تھا، ورنہ اس سے پہلے رائج مسلمانوں کے صدیوں پرانے نظامِ تعلیم پر غور کیا جائے تو اس میں مدرسے اور اسکول کی کوئی تفریق نہیں ملے گی۔ وہاں شروع سے لے کر اور انگریز کے زمانے تک مسلسل یہ صورت حال رہی کہ مدارس یا جامعات میں بیک وقت دینی اور عصری تعلیم دونوں دی جاتی تھیں۔

صورت حال یہ تھی کہ شریعت نے جو بات مقرر کی کہ عالم بننا ہر ایک آدمی کے لیے فرضِ

---

[۱] نائب مہتمم دارالعلوم کورنگی کراچی، ونائب صدر وفاق المدارس العربیہ

عین نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔یعنی ضرورت کے مطابق کسی بستی یا کسی ملک میں علماء پیدا ہوجائیں تو باقی سب لوگوں کی طرف سے وہ فریضہ ادا ہوجاتا ہے، لیکن دین کی بنیادی معلومات حاصل کرنا فرضِ عین ہے، یہ ہر انسان کے ذمے فرض ہے۔اُن مدارس کا نظام یہ تھا کہ اُن میں فرضِ عین کی تعلیم بلا امتیاز ہر شخص کو دی جاتی تھی، ہر شخص اُس کو حاصل کرتا تھا، جو مسلمان ہوتا تھا۔البتہ جس کو علمِ دین میں اختصاص حاصل کرنا ہو، اُس کے لیے الگ مواقع تھے۔جو کسی عصری علم میں اختصاص حاصل کرنا چاہتا تھا، اُس کے لیے مواقع الگ تھے۔

گزشتہ سال مَیں اور برادرم معظم حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مراکش میں تھے۔میں نے پچھلے سال دیکھا تھا اور حضرت نے اِس سال اُس کی زیارت کی۔مراکش کو انگریزی میں ''موروکو'' کہتے ہیں، اُس کا ایک شہر ہے جس کا نام ''فاس'' ہے۔مَیں ''فاس'' کے شہر میں پچھلے سال گیا تھا اور اِس سال حضرت بھی تشریف لے گئے تھے۔وہاں ''جامعۃ القرویین'' کے نام سے ایک جامعہ آج تک کام کررہی ہے۔اگر ہم اسلامی تاریخ کی مشہور اسلامی جامعات کا جائزہ لیں تو چار بنیادی اسلامی جامعات ہماری تاریخ میں نظر آتی ہیں۔اُن میں سب سے پہلی مراکش کی جامعہ ''القرویین'' ہے۔دوسری تیونس کی جامعہ ''زیتونہ'' ہے۔تیسری مصر کی ''جامعۃ الازہر'' ہے اور چوتھی ''دارالعلوم دیوبند'' ہے۔تاریخی ترتیب اسی طرح ہے۔

اس میں سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی جو مراکش کے شہر ''فاس'' میں قائم ہوئی، تیسری صدی ہجری کی جامعہ ہے۔ابھی تک ایسی کوئی ترتیب میرے سامنے نہیں آئی کہ یہ صرف عالم اسلام ہی کی نہیں، بلکہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے۔اس تیسری صدی کی یونیورسٹی کے بارے میں اُس کی تاریخ کے کتابچے میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ اُس وقت جامعۃ القرویین میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے اُن میں اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ اور اس کے ساتھ ساتھ طب، ریاضی، فلکیات جنہیں ہم آج عصری علوم کہتے ہیں، وہ سارے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ابن خلدونؒ، ابن رُشدؒ، قاضی عیاضؒ اور ایک طویل فہرست ہمارے اکابر کی ہے جنہوں نے جامعۃ القرویین میں درس دیا۔اُن کے پاس یہ تاریخ آج بھی محفوظ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ابن خلدونؒ درس دیا کرتے تھے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں ابن رُشدؒ درس دیا کرتے تھے۔یہ وہ جگہ ہے جہاں قاضی عیاضؒ نے درس دیا ہے۔یہاں ابن عربی مالکیؒ نے درس دیا ہے۔

تاریخ کی یہ ساری باتیں اُن کے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ یہ دنیا کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، اس لحاظ سے کہ چھوٹے چھوٹے مدارس تو ہر جگہ ہوں گے، لیکن جامعۃ القرویین ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتی تھی جس میں تمام دینی اور عصری علوم پڑھائے جاتے تھے۔

اس یونیورسٹی میں آج بھی تیسری اور چوتھی صدی کی سائنٹفک ایجادات کے نمونے رکھے ہیں۔ اُس زمانے میں اسی جامعۃ القرویین سے فارغ لوگوں نے جو ایجادات گھڑی وغیرہ کی کیں، اُن ایجادات کے نمونے بھی وہاں پر موجود ہیں۔ آپ تیسری صدی ہجری کا تصور کیجیے۔ یہ تیسری صدی ہجری کی یونیورسٹی ہے۔ اس میں اسلامی علوم کے بادشاہ بھی پیدا ہوئے اور وہیں سے ابن رُشد فلسفی بھی پیدا ہوا اور وہیں سے بڑے بڑے سائنسدان بھی پیدا ہوئے۔ ہوتا یہ تھا کہ دین اسلام کا فرضِ عین علم سب کو اکٹھا دیا جاتا تھا۔ اُس کے بعد اگر کوئی علمِ دین میں تخصص حاصل کرنا چاہتا تھا تو وہ اسی جامعۃ القرویین میں علم دین کے شعبے میں پڑھتا۔ اگر کوئی ریاضی پڑھانے والا ہے تو وہ ریاضی بھی وہاں پڑھا رہا ہوتا۔ اگر کوئی طب پڑھانے والا ہے تو وہ طب بھی وہاں پڑھا رہا ہوتا۔ یہ سارا کا سارا نظام اس طرح چلا کرتا تھا۔ جامعۃ القرویین کی طرح جامعہ زیتونہ تیونس اور جامعۃ الازہر مصر کا نظامِ تعلیم بھی رہا۔ یہ تینوں یونیورسٹیاں ہمارے قدیم ماضی کی ہیں۔ ان میں دینی اور عصری تعلیم کا سلسلہ اس طرح رہا۔

اس میں آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اگر قاضی عیاضؒ جو حدیث اور سنت کے امام ہیں، اُن کا حلیہ دیکھا جائے اور ابن خلدون جو فلسفۂ تاریخ کے امام ہیں، ان کا حلیہ دیکھا جائے، دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ یہ دین کا عالم ہے اور وہ دنیا کا عالم ہے۔ دونوں کا حلیہ، لباس، ثقافت، طرزِ زندگی، طرزِ کلام سب یکساں تھا۔ اگر آپ مشہور اسلامی سائنسدانوں فارابی، ابن رُشد، ابوریحان البیرونی وغیرہ کا حلیہ دیکھیں اور جو محدثین، مفسرین اور فقہاء پیدا ہوئے اُن کا حلیہ دیکھیں تو دونوں کا حلیہ ایک جیسا نظر آئے گا۔ اگر وہ نماز پڑھتے تھے تو یہ بھی نماز پڑھتے تھے۔ اگر اُن کو نماز کے مسائل معلوم تھے تو اِن کو بھی معلوم تھے۔ اگر اُن کو روزے کے مسائل معلوم تھے تو اِن کو بھی معلوم تھے۔ بنیادی اسلامی تعلیمات جو ہر انسان کے ذمے فرضِ عین ہیں، اُس دور میں ہر انسان جانتا تھا اور اس یونیورسٹی میں اُس کو پڑھایا جاتا تھا۔ تفریق یہاں سے پیدا ہوئی کہ انگریز نے آکر باقاعدہ سازش کے تحت ایک ایسا نظامِ تعلیم جاری کیا کہ اس

سے دین کو دیس نکالا دے دیا گیا۔ اُس وقت ہمارے اکابرین مجبور ہوئے کہ وہ مسلمانوں کے دین کے تحفظ کے لیے کم از کم جو فرضِ کفایہ ہے، اُس کا تحفظ کریں۔ اُنہوں نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا جس نے الحمدللہ! وہ خدمات انجام دیں جس کی تاریخ میں نظیر ملنا مشکل ہے، لیکن یہ ایک مجبوری تھی۔ اصل حقیقت وہ تھی جو جامعۃ القرویین میں تھی، جو جامعہ زیتونہ میں تھی، جو جامعۃ الازہر کے ابتدائی دور میں تھی۔ اصل حقیقت وہ تھی۔ اگر پاکستان صحیح معنی میں اسلامی ریاست بنتا اور صحیح معنی میں اس کے اندر اسلامی احکام کا نفاذ ہوتا تو پھر اُس صورت میں ہمیں بقول حضرت والد ماجدؒ کے نہ علیگڑھ کی ضرورت تھی، نہ ندوہ کی ضرورت تھی، نہ دارالعلوم دیوبند کی ضرورت تھی، ہمیں جامعۃ القرویین کی ضرورت ہے، جامعہ زیتونہ کی ضرورت ہے اور ایسی یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس میں سارے کے سارے علوم اکٹھے پڑھائے جائیں۔ سب دین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، چاہے وہ انجینئر ہو، چاہے وہ ڈاکٹر ہو، چاہے کسی بھی شعبۂ زندگی سے وابستہ ہو، وہ دین کے رنگ میں رنگا ہوا ہو، لیکن ہم پر ایسا نظامِ تعلیم لاد دیا گیا جس نے ہمیں سوائے ذہنی غلامی سکھانے کے اور کچھ نہیں سکھایا۔ اُس نے ہمیں غلام بنایا۔ اکبر الہ آبادی نے صحیح کہا تھا ؎

اب علی گڑھ کی بھی تم تمثیل لو
اب معزز پیٹ تم اُس کو کہو

صرف پیٹ بھرنے کا ایک راستہ نکالنے کے لیے انگریز یہ نظامِ تعلیم لایا اور اُس کے نتیجے میں مسلمانوں کی پوری تاریخ اور پورا ورثہ تباہ کر دیا گیا۔

نتیجہ یہ کہ آج کل کے مروجہ نظامِ تعلیم کے ذریعے دو زبردست فرق واضح طور پر سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے فرضِ عین کا بھی معلوم نہیں۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے اکثر طالب علم جانتے ہی نہیں ہیں کہ دین میں فرض کیا ہے؟ دوسرے اُن کے اوپر افکار مسلط کر دیے گئے ہیں کہ اگر عقل اور ترقی چاہتے ہو تو تمہیں مغرب کی طرف دیکھنا ہوگا۔ تیسرے ان کی ثقافت بدل دی گئی۔ ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ اگر اس دنیا میں ترقی چاہتے ہو تو صرف مغربی اَفکار میں ملے گی، مغربی ماحول میں ملے گی، مغربی انداز میں ملے گی۔ افسوس یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم سے جو گریجویٹس، ڈاکٹرز

یا پروفیسرز بن کر پیدا ہوتے ہیں، وہ ہم جیسے طالب علموں پر تو روز تنقید کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا، یہ اجتہاد نہیں کرتے۔قرآن وسنت اور فقہ میں ''اجتہاد'' ایک عظیم چیز تھی، لیکن ایک ایسی چیز جس میں اجتہاد کا دروازہ چاروں طرف چوپٹ کھلا ہوا تھا، وہ تھی سائنس اور ٹیکنالوجی، ریاضی، علومِ عصریہ اس میں تو کسی نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا۔ علیگڑھ کے اور اس جدید نظامِ تعلیم کے ذریعے آپ نے کیوں ایسے مجتہد پیدا نہیں کیے جو مغرب کے سائنسدانوں کا مقابلہ کرتے۔اُس میں آپ نے کیوں ایسے مجتہد پیدا نہیں کیے جو اجتہاد کر کے طب، فلکیات، ریاضی، سائنس وغیرہ میں نئے راستے نکالتے۔اجتہاد کا دروازہ جہاں چوپٹ کھلا تھا وہاں کوئی اجتہاد کیا ہی نہیں، اور جہاں قرآن وسنت کی پابندی ہے اور قرآن وسنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد کرنا ہوتا ہے، وہاں شکایت ہے کہ علمائے کرام اجتہاد کیوں نہیں کرتے؟

ابھی کچھ دن پہلے کسی صاحب نے ایک کلپ بھیجا جس میں ایک عالم دین سے یہ سوال کیا جارہا تھا کہ مولانا! یہ بتائیے کہ علمائے کرام کی خدمات ویسے تو اپنی جگہ ہیں، لیکن یہ کیا بات ہے کہ علمائے کرام میں کسی طرف سے بھی کوئی سائنسدان پیدا نہیں ہوا، کوئی ڈاکٹر پیدا نہیں ہوا، کسی بھی طرح کی ایجاد نہیں ہوئی، اس کا علمائے کرام کے پاس کیا جواب ہے؟ بندۂ خدا! یہ سوال تو آپ اپنے آپ سے کرتے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں کوئی ایسا مجتہد پیدا ہوا جس نے کوئی نئی ایجاد کی ہو؟ لیکن وہاں تو اجتہاد کے دروازے اس طرح بند ہیں کہ جو انگریز نے کہہ دیا، مغرب نے کہہ دیا بس وہ صحیح نظریہ ہے، اُس نے جو دواء بتادی وہ دواء ہے، اُس نے اگر کسی چیز کے بارے میں کہہ دیا کہ یہ صحت کے لیے مضر ہے تو اس کی اقتداء کرتے ہیں۔ انڈے کی زردی کے بارے میں سالہا سال سے کہا جارہا تھا کہ یہ کولیسٹرول پیدا کرتی ہے اور امراضِ قلب میں مضر ہوتی ہے، لیکن آج اچانک ہر ڈاکٹر یہ کہہ رہا ہے کہ انڈے کی زردی کھاؤ، اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ مغرب سے یہ پیغام آ گیا ہے، اُسے آپ نے قبول کر لیا ہے۔

ہمارے ملک میں بے شمار جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں، اُس پر آپ نے کبھی تحقیق کی ہوتی، اُس سے آپ نے کوئی نتیجہ نکالا ہوتا کہ فلاں جڑی بوٹی ان امراض کے لیے فائدہ مند

ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلونجی کے فوائد بیان فرمائے تھے، اُس پر کوئی تحقیق کی ہوتی۔ وہاں تو اجتہاد کا دروازہ ٹوٹل بند ہے اور اُس میں کوئی تحقیق کا راستہ نہیں، اور جو قرآن و سنت کی بات ہے اُس میں اجتہاد کا مطالبہ ہے۔ یہ ذہنی غلامی کا نظام ہے جس نے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا۔ دوسرا یہ کہ تصورات بدل گئے۔ پہلے علم کا تصور ایک معزز چیز تھی جس کا مقصد معاشرے اور مخلوق کی خدمت تھی، یہ اصل مقصود تھا۔ اس کے تحت اگر معاشی فوائد بھی حاصل ہو جائیں تو ثانوی حیثیت رکھتے تھے، لیکن آج معاملہ الٹا ہو گیا، علم کا مقصد صرف پیسہ کمانا ہے۔ علم کا مقصد یہ ہے کہ اتنا علم حاصل کرو کہ لوگوں کی جیب سے زیادہ سے زیادہ پیسہ نکال سکو۔ تمہارا علم اس وقت کارآمد ہے کہ جب تم لوگوں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کما سکو۔ آپ دیکھیں کہ موجودہ دور میں کتنے لوگ پڑھ رہے ہیں اور گریجویشن کر رہے ہیں، ماسٹر ڈگریاں لے رہے ہیں، قسم قسم کی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں، اُن سے پوچھا جائے کہ کیوں پڑھ رہے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اس لیے پڑھ رہے ہیں کہ کیریئر اچھا ہو، اچھی ملازمتیں ملیں، پیسے زیادہ ملیں۔ تعلیم کی ساری ذہنیت بدل کر یہ تبدیلی کر دی کہ علم کا مقصد پیسہ کمانا ہے۔ علم حاصل کر کے معاشرے یا مخلوق کی کوئی خدمت انجام دینی ہے، اس کا کوئی تصور موجودہ جدید نظامِ تعلیم میں نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص پیسہ کمانے کی دوڑ میں مبتلا ہے۔ اُس کو نہ وطن کی فکر ہے، نہ ملک و ملت کی فکر ہے اور نہ مخلوق کی خدمت کا کوئی جذبہ اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ دن رات اسی دوڑ دھوپ میں مگن ہے کہ پیسہ زیادہ کمانا چاہیے۔ اُس کے لیے چوری، ڈاکہ، رشوت وستانی وغیرہ کے ناجائز ذرائع بھی وہ استعمال کرتا ہے۔

یہ بتایئے! موجودہ نظامِ تعلیم کے تحت جو لوگ یہاں تیار ہو رہے ہیں، انہوں نے مخلوق کی کتنی خدمت کی؟ کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچایا؟ ہمیں تو پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی تھی: [illegible]

رَغْبَتِنَا ـ ’’یا اللہ! دنیا کو ہمارے لیے نہ تو ایسا بنایئے کہ ہمارا ہر وقت دھیان دنیا ہی کی طرف رہے اور نہ ہمارے علم کا سارا مَبلغ دنیا ہی ہو کر رہ جائے، اور نہ ہماری ساری رغبتوں اور شوق کا مرکز دنیا ہو کر رہ جائے۔‘‘ لیکن اس نظامِ تعلیم نے کایا پلٹ دی۔

حضرت والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو بات فرمائی تھی اُس کا منشاء یہ تھا کہ انگریز

کی غلامی کے بعد جو تعلیم کی کایا پلٹی گئی ہے، اُس کو دوبارہ پلٹ کر اُس راستے پر چلیں جو راستہ جامعۃ القرویین نے دکھایا، جو جامعہ زیتونہ نے دکھایا، جو ابتدائی دور میں جامعۃ الازہر نے دکھایا۔ مَیں ابتدائی دور کی بات اس لیے کر رہا ہوں کہ آج جامعہ ازہر کی بھی کایا پلٹ چکی ہے، اسی لیے ابتدائی دور کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے یہاں حکومتی سطح پر وہ نظام تعلیم نافذ نہیں ہوسکا، لہٰذا مجبوراً کم از کم دار العلوم دیوبند کے نظام کا تحفظ تو ہو۔ الحمدللہ! اسی غرض سے مدارس قائم ہوئے۔ جب تک ہمیں حکمرانوں اور نظامِ حکومت پر اور اُن کے بنائے ہوئے قوانین پر بھروسہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں کوئی بھروسہ ہونے کی امید ہے، اس لیے اُس وقت تک ہم اِن مدارس کا پورا تحفظ کریں گے۔ مدارس کو اسی طرح برقرار رکھیں گے جس طرح ہمارے اکابر نے دیوبند کو برقرار رکھا۔ اس کے اوپر ان شاء اللہ کوئی آنچ بھی نہیں آنے دیں گے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ قوم اُس طرف بڑھے جو ہمارا ابتدائی مطمحِ نظر تھا۔ اسی سلسلے میں حرا فاؤنڈیشن کی یہ چھوٹی سی تقریب تھی۔

اس میں رئیس الجامعہ کا چھوٹا سا خطاب تھا اور مَیں بھی اسے ہر جگہ بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ الحمدللہ! پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد بقدرِ ضرورت اچھی خاصی ہوگئی، لیکن سارے مدارس فرضِ کفایہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے والوں کا تناسب پورے ملک کے حساب سے دیکھا جائے تو مشکل سے ایک فیصد ہوگا، لیکن ننانوے فیصد قوم جن اداروں میں جارہی ہے اور جس طرح وہ انگریزوں کی ذہنی غلام بن رہی ہے، اس تعداد کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مَیں یہ بات کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں اور کہتا رہتا ہوں کہ آپ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کے لیے ہماری اس نسل کو انگریز کی ذہنی غلامی سے نکالیے۔ آپ کو یہ تاثر دینا ہے کہ الحمدللہ! ہم ایک آزاد قوم ہیں، ہم ایک آزاد سوچ رکھتے ہیں، ہم اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوچ رکھتے ہیں اور یہ جو ذہنی غلامی کا تصور پالا گیا ہے کہ جو کچھ ہوگا وہ مغرب سے آئے گا اور ہم مغربی افکار پر پروان چڑھیں گے، خدا کے لیے اس نئی نسل کے ذہنوں سے یہ چیز مٹائیے اور ان کے اندر اسلامی ذہنیت پیدا کیجیے۔ ہم نے اسی مقصد کے لیے یہ ادارہ قائم کیا۔ مغرب کی ہر بات بری نہیں ہے، کچھ چیزیں اچھی بھی ہیں، اُن اچھی چیزوں کو لے لو اور بری چیزوں کو

پھینک دو، ‰ VŌĻý 9, ĐLşĒĻy Xµ کے اصول پر اگر کام کیا جائے تو ان شاء اللہ ہم منزل تک پہنچ جائیں گے۔

اقبال مرحوم نے بعض اوقات ایسے حسین تبصرے کیے ہیں کہ وہ قوم کے لیے مشعل راہ ہیں۔ مغرب کی ترقی جو کہیں سے کہیں پہنچی ہے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے چند شعر کہے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھنے کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نَے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب

چنگ و رباب یعنی موسیقی کے آلات۔ مغرب کی قوت اس لیے نہیں ہوئی کہ وہاں موسیقی کا بڑا رواج ہے، نہ اس وجہ سے ہوئی کہ بے حجاب اور بے پردہ عورتیں رقص کرتی ہیں۔

نَے ز سحرِ ساحرانِ لالہ رُوست
نَے ز عریاں ساق و نَے ز قطع مُوست

نہ اس وجہ سے ہوئی کہ وہاں حسین عورتیں بہت پھرتی ہیں اور نہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی ٹانگیں ننگی کر رکھی ہیں اور اپنے بال دراز کر رکھے ہیں۔

قوتِ مغرب از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

قوت اگر ہوئی ہے تو علم و فن میں محنت کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسی آگ سے اُس کا چراغ روشن ہے۔ اور پھر آخر میں بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست

یعنی حکمت و علم کپڑوں کی قطع و برید یا تراش وخراش سے حاصل نہیں ہوتا۔ کسی نے پتلون پہن لی تو ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہو گئے۔ اگر شلوار قمیص پہن لی تو پسماندہ ہیں، ترقی پسند نہیں ہیں۔ اگر عمامہ پہن لیا تو اُس سے علم و ہنر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، لیکن تم نے چند مظاہر کو یہ سمجھا ہوا ہے کہ مغرب کو اُس سے قوت حاصل ہوئی ہے اور اُس کے نتیجے میں اپنی نسلوں کو اُس کے پیچھے چلا کر تباہ کر رہے ہو، لہٰذا اس سے اپنے آپ کو بچائیں۔

دینی مدارس

مولانا محمد یاسین ظفر[1]

دینی تعلیم کے مختلف پہلو

پاکستان میں اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی اصولوں کے مطابق پاکستانی معاشرے کی رہنمائی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل علماء کرام کو مؤثر کردار ادا کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے عمل کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو فروغ دے سکیں۔ کسی بھی قوم یا ملک کا نظام تعلیم اور نصاب ان کی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر قوم اسے اپنی ضروریات کے پیش نظر مرتب کرتی ہے۔

برصغیر میں انگریز کے آنے سے پہلے جو طریقۂ تعلیم یا نصاب رائج تھا وہ ہماری تمام ضروریات پوری کرر رہا تھا۔ مدارس کے فارغ التحصیل حکومت کی سطح سے لے کر زندگی کے ہر شعبے میں خدمات سرانجام دے رہے تھے، لیکن انگریزوں نے یہاں قدم رکھتے ہی جہاں بے شمار اصلاحات کیں، وہاں نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی تبدیل کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے عزائم کی تکمیل موجودہ نصاب اور نظام سے نہیں ہوگی۔ حکومت چلانے کے لیے ہر شعبے میں اپنی مرضی کے افراد فراہم کرنے کے لیے نصاب کے اندر مذہب کو نظرانداز کیا اور لادینی نظام نافذ کیا، مگر افسوس ان پر نہیں اپنوں پر ہے کہ ۷۱ سال بعد بھی ہم وہاں ہی کھڑے ہیں جہاں انگریز ہمیں چھوڑ کر گیا تھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ فوری طور پر نصاب میں انقلابی تبدیلیاں کی جاتیں اور ایسا نصاب اختیار کیا جاتا جو مذہبی نقطۂ نظر سے کامل اور جدید تقاضوں کے مطابق ہوتا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ دور کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا۔ اس طرح دینی مدارس اور جدید نظام تعلیم کے درمیان خلیج مکمل ختم نہیں تو قدرے کم ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب میں ان نکات کی طرف آتا ہوں جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔

کردار میں وسعت

دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء کے مصرف کا جہاں تک سوال ہے تو یہ صرف ایک

[1] ناظم اعلیٰ، وفاق المدارس السّلفیہ، فیصل آباد

شخص سے متعلق مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے آج تک انہیں صرف بطور امام، خطیب یا سکول کی حد تک آزمایا ہے، کیا کبھی کسی نے انہیں کسی اور میدان میں بھی جگہ دی ہے اور انہیں آزمایا ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ غیر تربیت یافتہ ہیں کسی اور میدان میں نہیں چل سکتے، میرے خیال میں غیر درست ہے۔ ہم نے انہیں کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اگر موقع ملے تو یقیناً اپنی اصلاحیتوں سے بہتر نتائج سامنے لاسکتے ہیں، مثال کے طور پر اس وقت کالج اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ اسلامیات اور عربی کام کررہے ہیں۔ ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جو مدرسین رکھے جاتے ہیں انہوں نے محض وہ معمولی اور مختصر نصاب پڑھا ہوتا ہے جو یونیورسٹی کی جانب سے مقرر ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر اس ضرورت کو معیاری درسگاہوں کے فارغ التحصیل علماء کرام سے پورا کیا جائے۔ یقیناً اس کے نتائج بہتر ہوسکتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھی اندازہ ہو کہ وہ اسلامیات کی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ میدان بن سکتا ہے۔

معیار کی بہتری

موجودہ صورت میں جو شخص بھی فارغ ہوتا ہے ایک نئے دینی مدرسہ کی بنیاد رکھ لیتا ہے اور چندہ کی فراہمی کے لیے بھرپور مہم چلاتا ہے جس کی وجہ سے مدرسوں کا معیار بہت ہی گر گیا ہے اور مستحق مدارس بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے جو وفاق منظور کیے ہیں ان کو ذرا متحرک اور منظم کیا جائے۔ ہر مسلک اپنے وفاق کو تسلیم کرنے اور ان کا بنایا ہوا نظام اور نصاب اپنے مدرسے میں رائج کرے اور حکومت کسی بھی نئے ادارے کو رجسٹرڈ نہ کرے تاوقتیکہ وہ وفاق کی طرف سے سرٹیفکیٹ پیش نہ کرے اور نہ ہی اسے ادارہ کھولنے کی اجازت دے اور ہر مدرسہ میں کم از کم پچاس طلبہ کا ہونا ضروری قرار دیا جائے اور وفاق اس نظام کے نفاذ کا ذمہ دار ہو۔

نصاب اور موجودہ دور کے تقاضے

عربی کا مقولہ ہے کہ ÏÏLΣ/ k â ţdž ہر میدان کے لیے آدمی مخصوص ہوتے ہیں، جس طرح کی انہیں تعلیم دی جائے اس طرح کا اگر ان سے کام لیا جائے تو بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ رہی بات موجودہ دور میں عصری قیادت کے پورا کرنے کی تو میرے خیال میں جو قیادت اس وقت سیاست دان مہیا کررہے ہیں، ان سے تو علماء کرام بہتر ہی انجام دیں گے

بشرطیکہ علماء صحیح معنوں میں عالم ہوں تو وہ یہ کام بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ انہیں پھر تربیت کی ضرورت ہے تاکہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے اس کے مسائل کو سمجھ کر فوری حل تلاش کر سکیں۔ اس سلسلے میں نصاب کے علاوہ ان کے لیے تربیت گاہیں کھولی جائیں اور ان میں تمام جدید مضامین رکھے جائیں۔

درسی کتب کی جدید طرز پر تیاری

نصابی کتب کی نئے سرے سے تجدید کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں جدید علوم کو بہتر طریقے سے سمو دیا جائے اور خاص کر دینی مدارس کے ابتدائیہ اور متوسطہ میں وہ کتب نصاب میں رکھ دی جائیں جو عرب ممالک (سعودیہ اور مصر) میں رائج ہیں تو کافی حد تک جدید تقاضے بھی پورے کرے گا اور حاشیوں کی بھرمار سے بھی نجات مل جائے گی۔

اساتذہ کی تربیت

موجودہ حالات میں سائنسی ایجادات اور نئی اصلاحات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خاص کر کمپیوٹر کے ذریعے قرآن کریم اور حدیث شریف میں جو تحقیق ہو رہی ہے ہر فارغ التحصیل کو اس سے آگاہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہاں ہر مکتب فکر کے علیحدہ مدارس ہیں، اسی نسبت سے علیحدہ علیحدہ مرکز ہوں اور ان میں جدید طریقوں سے تعلیم دینے کا خاص انتظام ہو۔

علاوہ ازیں اساتذہ کرام کی تربیت کے لیے مخصوص پروگرام ہونے چاہئیں۔ اس کا انتظام بھی مرکز کرے۔ اس پر فن تدریس، طریق تدریس، اصول تدریس جیسے موضوعات کے علاوہ عملی طور پر بھی تربیت ہونی چاہیے۔ اس کے لیے باہر سے کسی یونیورسٹی سے ویڈیو کیسٹ منگوائے جا سکتے ہیں اور ان کے ذریعے بہترین طریقے سے ان کا اسلوب اور طریقۂ تعلیم دیکھا جا سکتا ہے اور یہاں سے تربیت پانے والوں کو اسناد دی جائیں اور ان کی تقرری کی باقاعدہ سفارش کی جائے۔

مسلک کا اختلاف

دینی مدارس میں اختلافِ مسلک کے اسباب یوں تو اور بھی ہوں گے مگر ایک عام

اختلاف جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مدارس میں قرآن وحدیث سے براہ راست اکتساب کی بجائے فقہی مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فارغ التحصیل علماء فروعی مسائل میں اپنا سارا وقت صرف کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلک کے مدارس دن بدن زیادہ ہورہے ہیں۔ وہ اپنے مسلک کی ترویج کے لیے صرف امتیازی مسائل پر خصوصی توجہ دیتے ہیں بلکہ بعض مدارس صرف مناظرے کی تربیت دیتے ہیں۔ اگر مدارس میں قرآن وحدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کی تربیت دی جائے تو فروعی مسائل میں اختلافات کافی حد تک کم ہوسکتے ہیں۔

مدارس اور حکومت

پاکستان میں دینی مدارس کی دو اقسام ہیں۔ ایک اوقاف کے تحت چل رہے ہیں اور دوسرے صاحب ثروت حضرات کے عطیات وغیرہ سے چل رہے ہیں۔ موجودہ دور میں دینی مدارس اور حکومت میں زکوٰۃ اور دیگر فنڈز کے حصول کی حد تک رابطہ ہے جو کہ کسی طرح سودمند نہیں۔ چونکہ دینی مدارس کے منتظم اپنے مدارس میں حکومتی مداخلت پسند نہیں کرتے البتہ اس کے لیے وفاق المدارس کے تحت قواعد وضوابط بنانے چاہئیں اور ان کے نظم ونسق کے تحت درجہ بندی کے حساب سے تعلیم دی جائے تو کسی حد تک یہ نظام مربوط ہوسکتا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی رپورٹیں اس سلسلے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔

دو متوازی نظام

جدید تعلیمی نظام اور درس نظامی کو قریب لانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں اگر سعودیہ میں رائج نظام کا مطالعہ کیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ کم از کم بی اے کی سطح تک جو نظام ہے اسے اپنانے میں یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ لڑکے میں یہ استعداد پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ خود مسائل کو سمجھ کر ان کا حل ڈھونڈ سکتا ہے۔ اس کے بعد تخصص کی کلاسیں ہوں۔ یہ نظام دو نظاموں کو قریب لانے کے لیے نہایت مفید ہوسکتا ہے۔ دینی مدارس میں موجودہ نصاب میں ریاضی، تاریخ، ادبیات، پولیٹکل سائنس، ایجوکیشن وغیرہ مضامین کو ضم کیا جائے۔ منطق، علم کلام، علوم عقلیہ کی اصلاح کی جائے۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۳۵)

دینی مدارس　　　مدیر

مفتی تقی عثمانی صاحب اور مولانا یاسین ظفر صاحب کے مضامین پر البرہان کا تبصرہ

'تعلیمی ثنویت' کو ختم کرکے 'وحدتِ تعلیم' کی بنیاد پر

دینی مدارس 'نیا تعلیمی نظام' خود کیوں قائم نہیں کرتے؟

عصری علوم کی اسلامی تدوینِ نو کے لیے 'تحریکِ اصلاحِ تعلیم' کی پیشکش

ہم نے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی ایک تقریر کا متن اور مولانا یاسین ظفر صاحب کا مضمون لفظ بلفظ صفحاتِ سابقہ میں شائع کردیے ہیں اور انہیں پڑھ کر ہم بحرِ حیرت میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں اور ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ:

۱۔ جب مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۵۰ء میں یہ کہا تھا کہ دیوبند، علی گڑھ اور ندوہ کافی نہیں بلکہ اسلاف کے تعلیمی اداروں کی طرز پر (یعنی 'وحدتِ تعلیم' کی بنیاد پر) نئے نظامِ تعلیم کا قیام ناگزیر ہے تو اس بات پر نصف صدی ہونے کو ہے کیوں مفتی تقی عثمانی صاحب نے اپنے ادارے میں 'نیا نظامِ تعلیم' جاری نہیں کیا؟ اور کیوں والد ماجد کی اس بات کو نہیں پھیلایا اور عام کیا اور لوگوں کو اس پر عمل کی دعوت نہیں دی؟ اور کیوں انہوں نے (اور ان کے ساتھی علماء کرام نے) مروجہ جدید نظامِ تعلیم کی، جس میں نہ دینی علوم کی تدریس ہوتی ہے نہ تربیت، اصلاح کی کوشش نہیں کی؟ اس کے لیے تحریک کیوں نہیں چلائی؟ حکمرانوں سے اس کی اصلاح کا مطالبہ کیوں نہیں کیا اور ان پر دباؤ کیوں نہیں ڈالا؟

۲۔ اور کیا یہ طرزِ عمل درست ہے کہ 'وحدتِ تعلیم' کی بنیاد پر 'نیا نظامِ تعلیم' قائم کرنے کی بجائے موجودہ درسِ نظامی کو باقی رکھتے ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ 'جدید تعلیم' کے ایسے ادارے قائم کرنا شروع کردیے جائیں جن میں مغرب زدہ علوم، مغربی طرز اور اصولوں کے مطابق (جیسے انگلش میڈیم، آکسفورڈ کا نصاب، پری سکول، مونٹیسری اور او، اے لیول وغیرہ) پڑھائے جائیں اور انہیں `/VǬĿý 9, ĐĿṣÈĿýXµ`، کہہ کر قبول کرلیا جائے۔ اور اس بات سے صَرفِ نظر کرلیا جائے کہ مغرب کی تعلیم (اور اس کا چربہ جدید پاکستانی تعلیم) مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی پیداوار ہے اور بالآخر وہی الحادی ذہن پیدا کرتی ہے جو اسلام کا نقیض ہے تو جدید تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالے بغیر اسے کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس طرح کے اجتماعِ ضدّین سے وحدتِ تعلیم کے تصور کے مطابق وہ نیا نظام

تعلیم کیسے قائم ہو گا جو ہمارے اسلاف نے جامعہ قرویین اور جامعہ زیتونہ میں قائم کیا تھا اور جس کی طرف مفتی تقی عثمانی صاحب نے اشارہ کیا ہے؟

۳۔ سوال یہ بھی ہے کہ مفتی تقی عثمانی صاحب وفاق المدارس العربیۃ کے نائب صدر ہیں اور ماشاء اللہ قد آور اور بھاری بھر شخصیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح مولانا یاسین ظفر صاحب وفاق المدارس السّلفیہ کے ناظم اعلیٰ اور کرتا دھرتا ہیں۔ ان دونوں حضرات نے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے جس طرح جدید عصری تعلیم کی حمایت کی ہے (اور ہم بھی اس کی حمایت کرتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ تدریس سے پہلے اسے 'مسلمان' کیا جائے) اس کے بعد ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اپنے اپنے وفاقوں میں کیوں اسے جاری نہیں فرماتے؟ بلکہ البرہان کے پچھلے ماہ کے شمارے میں ہم نے دینی تعلیم کے پانچوں وفاقوں کے قائدین کا مشترکہ ومتفقہ بیان شائع کیا تھا کہ وہ اپنے وفاقوں میں جدید عصری علوم پڑھانے پر تیار ہیں بشرطیکہ حکومت ان کی ڈگریوں کو تسلیم کرے۔ ہم ان کے اس مطالبے کی حمایت کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے اس فیصلے پر عمل کریں خواہ حکومت ان کا مطالبہ مانے یا نہ مانے۔ آخر ایک مفید کام کو کرنے کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کو حکومت کا کندھا کیوں درکار ہے؟ وہ خود جدید علوم کو اسلامی تناظر میں مدون کریں اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کی بجائے ان میں اسلامی روح ڈالیں اور انہیں اپنے نظام ونصاب کا حصہ بنالیں۔ اس کے لیے انہیں حکومت سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں۔

۴۔ ہم پچھلے تیس سال سے یہی مطالبہ کرتے آرہے ہیں، اب جب کہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی سامنے آگئی ہے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب اور مولانا یاسین ظفر صاحب بلکہ دینی تعلیم کے سارے وفاقوں کے قائدین نے عصری علوم کی تدریس کی حمایت کردی ہے تو پھر اب اس پر عمل درآمد کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ اس کے لیے حکومتی تعاون یا امداد کی شرط کیوں؟ بس عصری علوم کو مسلمان کیجیے اور پڑھائیے۔ اور آپ سب اساتذہ ہیں آپ کو معلوم ہے کہ نصاب کو اسلام کے مطابق کیسے ڈھالنا ہے؟ اگر کچھ مشاورت اور فنی معاونت درکار ہو تو ہم جیسے یونیورسٹیوں کے لوگ، جو آپ کے ہم خیال اور آپ کے خادم ہیں، اس کے لیے حاضر ہیں۔ بلکہ ہم تجویز دیں گے کہ عصری علوم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے، نصابی کتب تیار کرنے اور اس غرض سے اساتذہ کی تربیت کرنے کا کام سارے وفاقوں کی

متحدہ تنظیم کے زیر نگرانی ہو کیونکہ اس کام میں مسلکی اختلافات کا امکان کم ہے اور سب وفاقوں کے لیے عصری علوم کی یکساں نصابی کتب بآسانی مرتب کی جا سکتی ہیں، جس کے لیے 'تحریک اصلاحِ تعلیم' اپنی خدمات پیش کرتی ہے۔ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ؟

۵۔ یاد رہے کہ دینی مدارس دینی تعلیم کی تخصص کے ادارے ہیں جو علماء کرام تیار کرتے ہیں۔ یہ فرض کفایہ ادا کرنے والے وہ تعلیمی ادارے نہیں ہیں جو عام مسلمانوں کو فرض کفایہ والی تعلیم دیں۔ فرض کفایہ والا کام پرائمری سکول کی سطح پر ہونا چاہیے کیونکہ تعلیمی اعداد و شمار کے مطابق پرائمری کے بعد ڈراپ آؤٹ ریٹ تقریباً پچاس فیصد ہے (یعنی پچاس فیصد بچے تعلیم چھوڑ جاتے ہیں) لہٰذا یہ کام اسی سطح پر کرنا موزوں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں مڈل بھی شامل کر لیجیے۔ اس طرح دینی مدارس کو بھی ایسے طلبہ مل جائیں گے جنہوں نے بنیادی دینی تعلیم حاصل کر رکھی ہو گی۔

نو دس سال کی یہ ابتدائی تعلیم، (بشمول پری پرائمری کے ایک دو سال) ہماری رائے میں بچے کی تعمیر شخصیت کے حوالے سے بہت اہم ہے اور یہ لازماً علماء کرام کے ہاتھ میں ہونی چاہیے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ دینی مدارس کو اس کا انتظام کرنا چاہیے تا کہ یہ تعلیم اسلامی تناظر میں دی جا سکے اور ہر مسلمان بچہ وہ تعلیم حاصل کر لے جو فرض عین کی حیثیت رکھتی ہے۔

٦۔ ہم بڑے ادب کے ساتھ مفتی تقی عثمانی صاحب، مولانا یاسین ظفر صاحب اور دیگر علماء کرام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ ثنویت کے خاتمے اور وحدت تعلیم کو اپنانے کے مسئلے کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ پاکستان بننے کے بعد موجودہ درس نظامی کے جاری رکھنے کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ علماء کرام کے اس بات سے صَرفِ نظر کرنے سے ہمارا اور امت کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ علماء کے عصری تعلیم نہ اپنانے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ نے معاشرے اور ریاست کی تقدیر خود ان لوگوں کے سپرد کر دی ہے جو جاہل ہیں، دین سے نابلد ہیں اور سیکولرزم ولبرل ازم کے اسیر اور مغرب کی پیروی کے دل دادہ ہیں تو اس کا ذمہ دار کون ہوا؟

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ اتنا بنیادی اور بڑا کام ہے کہ اگر حکومت نہیں کرتی تو علماء کرام خود کریں؟ کیا ماضی میں علماء کرام نے بارہ سو سال تک یہ کام نہیں کیا؟ اس وقت بھی معاشرہ آپ کی پشت پر تھا اور اگر آپ اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں تو معاشرہ آج بھی آپ کی

پشت پر کھڑا ہوگا (خواہ حکومتیں نہ ہوں) جس طرح کہ وہ آج بھی مدارس اور مساجد چلانے کے لیے آپ کی پشت پر کھڑا ہے۔ ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ اس کام کو آپ حکومت پر چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے کہ یہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ پاکستان کے چار کروڑ مسلمان بچے دین کی بنیادی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں اور علماء کرام کہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں! یہ کیسے ممکن ہے؟ اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کام کیے بغیر علماء کرام اپنی ذمہ داری سے کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟

تلخیصِ بحث

ہماری گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ پری پرائمری سے مڈل تک کی تعلیم علماء کرام اور دینی مدارس کے پاس ہونی چاہیے اور وہ تعلیم بھی اس کا حصہ ہونی چاہیے جو فرضِ عین ہے۔ ثانویہ عامہ، خاصہ اور عالیہ میں جو عصری علوم میں پڑھائے جائیں، ان کی نصابی کتب بھی مدارس اسلامی تقاضوں کے مطابق خود تیار کریں اور عالیہ و تخصص کی تعلیم کو بھی علوم قرآن، حدیث اور فقہ تک محدود رکھنے کی بجائے سماجی علوم تک ممتد کیا جائے۔

اعتذار

ہمارے دل میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، مولانا محمد یاسین ظفر صاحب اور دیگر علماء کرام کا بڑا احترام ہے۔ ان سطور کا مقصد ان پر تنقید کرنا نہیں بلکہ ان کو تعلیم کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ ہماری اس تحریر سے اگر وہ گرانی محسوس کریں تو ہم ان سے معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے پیش نظر ان کی دل آزاری نہیں۔

بقیہ: دینی تعلیم کے مختلف پہلو

دیگر مسلم ممالک

دیگر اسلامی ممالک میں دینی تعلیم کا نظام مختلف ہے۔ بعض ممالک میں دینی مدارس بھی حکومت کے زیر اثر چل رہے ہیں لیکن ان کے حالات اتنے اچھے نہیں (مثلاً مالدیپ) انڈونیشیا میں دینی مدارس آزادی سے کام کررہے ہیں۔ اکثر مدارس کا نصاب ملتا جلتا ہے جس کے نہایت اچھے نتائج ہیں اور طلبہ کے اندر استعداد بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح سعودیہ میں بھی دینی مدارس حکومت کے تحت ہیں لیکن ان پر علماء حاوی ہیں جس کی وجہ سے نتائج بہت اچھے ہیں۔

دینی تعلیم

پروفیسر محمد عاصم حفیظ

دینی مدارس کے اساتذہ اور ائمہ مساجد کا معاوضہ مزدور کی کم از کم تنخواہ سے بھی کم کیوں ہے؟

یومِ مزدور اور علماء کرام

حکومت، مدارس کے مہتمم حضرات اور مساجد کمیٹیاں اپنی ذمہ داری پوری کریں

آج یکم مئی ہے۔ ارض پاک میں کچھ محنت کش کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں ایک مزدور کے برابر اجرت بھی نہیں ملتی۔ ان کی ڈیوٹی کے اوقات کسی مزدور سے کہیں زیادہ ہیں۔ ایک مزدور تو اپنی ذمہ داری پوری کر کے اجرت وصول کر لیتا ہے لیکن انہیں اپنے ''مالکوں'' کی بہت سی باتیں سننا پڑتی ہیں۔ یوم مزدور پر کوئی بھی ان کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ ہمارا اشارہ دینی مدارس کے اساتذہ اور مساجد کے ائمہ وعلماء کرام کی طرف ہے جن کے معاوضے مزدور کی کم سے کم تنخواہ سے بھی کہیں کم ہوتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک قاری صاحب کو کئی سال ایک ادارے میں پڑھانے کے بعد اس وجہ سے نکال دیا گیا کہ انہوں نے اپنی 8 ہزار تنخواہ میں کچھ اضافہ کی بات کی تھی۔ یہ ایک استاد کی کہانی نہیں ہے آپ کو رمضان المبارک میں کئی مدارس کے اشتہار ملیں گے جن میں اساتذہ کرام کی تنخواہیں ادا کرنے کی اپیل کی گئی ہوگی۔ لاہور کے پوش ترین علاقے کے ایک دینی مدرسے میں استاد کو بارہ سے تیرہ ہزار معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جی! اس تنخواہ میں اسے نہ صرف اپنے خاندان کو پالنا ہوتا ہے بلکہ صحت، تعلیم، رہائش اور دیگر ضرورتوں کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ انہیں مزدور تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس لیے انہیں سوشل سیکیورٹی اور کسی بھی قسم کی سرکاری سہولیات بھی میسر نہیں ہوتیں۔ مدارس اور مساجد میں حفظ قران اور درس نظامی کے اساتذہ کرام کی تنخواہیں سرکاری طور پر مزدور کی کم سے کم تنخواہ کے برابر بھی نہیں ہوتیں۔ یقین مانیں بعض اوقات صرف آٹھ سے دس ہزار میں انہیں 24 گھنٹے کے لیے ملازم بنالیا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض "مالک حضرات" تو صفائی اور دیگر ذمہ داریاں بھی انہی سے پوری کراتے ہیں۔

آج یوم مزدور ہے ہر کہیں مزدوروں کی بات ہوگی لیکن کوئی بھی قرآن و حدیث

پڑھانے والے ان محنت کشوں کی بات نہیں کرے گا جنہیں ارض پاکستان میں اپنے بنیادی حقوق تک میسر نہیں۔معاشرہ انہیں صرف "مستحق" کا مقام دیتا ہےاور کوئی بھی مالدار شخصیت یا انتظامیہ کے سیٹھ صاحب تنخواہ دیتے یا کوئی بھی چھوٹی سی رقم عنایت کرتے وقت صدقہ و خیرات کی نیت ضرور کر لیتے ہیں۔لاکھوں کے اخراجات اور پرشکوہ عمارتوں پر مشتمل مساجد و مدارس کے اساتذہ کرام زندگی کی گھڑیاں سسک سسک کر گزار رہے ہیں۔انہیں معاشرے کے پسماندہ ترین طبقے کے طور پر زندگی گزارنا پڑتی ہے۔دوسروں کے بچوں کو قرآن وحدیث پڑھا کر ان کی زندگیاں سنوارنے والے خود اپنے بچوں کے لیے مناسب تعلیم کا بندوبست نہیں کر پاتے۔کئی اداروں میں رہائش کا احسان کیا جاتا ہے لیکن وہ ایک کمرے یا حجرے سے بڑھ کر نہیں ہوتی جس میں انھیں پوری فیملی سمیت گزارا کرنا ہوتا ہے۔حکومت مزدوروں کے لیے کئی مراعات کا اعلان کرتی ہے لیکن یہ سب ان تک نہیں پہنچ پاتا۔شاید ہی کوئی مدرسہ، مسجد یا دینی ادارہ ایسا ہو جس نے حکومتی سوشل سکیورٹی کے اداروں میں اپنے اساتذہ کرام کی رجسٹریشن کرائی ہو۔کوئی بھی رجسٹرڈ ادارہ سوشل سکیورٹی کے حکومتی اداروں کے ساتھ منسلک ہوسکتا ہے۔

اس حوالے سے اگر کوئی مشکلات ہیں بھی تو دینی مدارس کے وفاقوں اور دینی جماعتوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے تاکہ دین کی اشاعت وتبلیغ سے منسلک یہ لوگ معاشرے میں ضروریہ بنیادی سہولیات سے مستفید ہوسکیں۔انہیں بڑھاپے میں پنشن،صحت، رہائش اور تعلیم سے متعلق دیگر سرکاری سہولیات مل سکیں۔دوسری طرف حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ دینی اداروں سے منسلک ان اساتذہ کرام کو معقول تنخواہ دے۔آخر کیوں حکومت کے کروڑوں اربوں کے بجٹ میں سے کچھ حصہ دینی تعلیم اور دینی مدارس کے معلمین کے لیے مختص نہیں کیا جاسکتا؟ حکومت کو چاہیے کہ وہ دیگر پرائیویٹ اداروں کی طرح دینی مدارس اور مساجد کے علماء کرام کے لیے بھی سوشل ویلفیئر کی بنیادی سہولیات فراہم کرنے کے لئے اقدامات کرے۔ قرآن وحدیث کی تدریس سے منسلک ان عظیم لوگوں کو کم سے کم مزدور ہی تسلیم کر لیا جائے تاکہ وہ بھی سرکاری سہولیات سے مستفید ہوسکیں۔

فہم دین　　محمد خاں منہاس(۱)

رمضان المبارک میں حصول تقویٰ
احادیث کی روشنی میں

رمضان المبارک تربیت اور برکتوں کا مہینہ ہے۔ حصول تقویٰ کے لیے روزہ انتہائی موثر ذریعہ ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث پر کما حقہ عمل کر کے تقویٰ حاصل کیا جا سکتا ہے اور انسان اپنے آپ کو تقویٰ کے فیوض و برکات سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

روزہ کو خراب کرنے والے اعمال

۱۔ اَلصِّیَامُ جُنَّۃٌ، وَاِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفَثْ وَلَا یَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّہٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَہٗ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ امْرُؤٌ صَائِمٌ. [بخاری و مسلم]

''روزہ (شیطانی کاموں سے بچانے والی) ڈھال ہے اور جب تم میں سے کوئی روزہ دار ہو تو زبان سے فحش بات نہ نکالے، نہ شور و ہنگامہ کرے۔ اور اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑائی پر آمادہ ہو تو روزہ دار یہ کہے کہ مَیں تو روزہ سے ہوں (میرے لیے مناسب نہیں کہ گالی دوں اور لڑائی کروں)۔''

روزے میں معصیتوں سے پرہیز

۲۔ مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ، فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ. [بخاری و مسلم]

''جس شخص نے (روزہ رکھنے کے باوجود) جھوٹ بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اُس کے بھوکا اور پیاسا رہنے سے کوئی دلچسپی اور مطلب نہیں۔''

۳۔ لَیْسَ الصِّیَامُ مِنَ الْاَکْلِ وَالشُّرْبِ، اِنَّمَا الصِّیَامُ مِنَ اللَّغْوِ وَالرَّفَثِ، فَاِنْ سَابَّکَ اَحَدٌ اَوْجَھِلَ عَلَیْکَ فَلْ تَقُلْ : اِنِّیْ صَائِمٌ ، اِنِّیْ صَائِمٌ. [صحیح ابن خزیمہ]

---

(۱) الفوز اکیڈمی، اسلام آباد

''روزہ (محض) کھانے پینے سے رُک جانے کا نام نہیں، بلکہ بیہودہ اور فحش کاموں سے رکنے کا نام ہے،لہٰذا اگر تم سے کوئی گالی گلوچ کرے یا جہالت سے پیش آئے،تو تم اسے کہہ دو کہ میں روزے سے ہوں! میں روزے سے ہوں!۔''

۴۔ كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاءُ وَكَمْ مِّنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهٖ اِلَّا السَّهَرُ. [دارمی]

''کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ پلے نہیں پڑتا اور کتنے ہی کھڑے ہونے والے ایسے ہیں کہ انہیں اپنے قیام سے رات جاگنے کے سوا کچھ پلے نہیں پڑتا۔''

۵۔ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ. [بخاری ومسلم]

''جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے اس کے سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور جو رمضان میں ایمان اور احتساب کے ساتھ کھڑا ہوگا اس کے بھی سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور جو شب قدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کرے گا اس کے بھی سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

دوسروں کو افطاری کرائیے

۶۔ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ ، غَيْرَ اَنَّهُ لَا يَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا. [ترمذی]

''جس نے کسی روزے دار کو روزہ افطار کرایا، اُسے بھی اُتنا ہی اجر ملے گا جتنا اجر روزے دار کے لیے ہوگا، اور روزے دار کے اجر میں کمی نہ ہوگی۔''

رمضان المبارک میں کثرت سے اللہ کی راہ میں خرچ کیجیے

۷۔ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ. [بخاری]

''آخری عشرے میں آپ ﷺ کی سخاوت، تیز ہواؤں سے بھی زیادہ بڑھ جاتی۔''

آخری عشرے میں اپنے اہل وعیال کو عبادات کے لیے خصوصی ترغیب دیجیے

۸۔ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَجْتَهِدُ فِيْ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ. [سنن ابن ماجہ]

''رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں، باقی ایام کی بہ نسبت، عبادات میں بہت زیادہ محنت فرماتے۔''

۹۔ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ، شَدَّ مِئْزَرَهٗ، وَاَحْیٰ لَیْلَهٗ، وَأَيْقَظَ اَهْلَهٗ. [بخاری]

''جب رمضان کے آخری دس دن شروع ہوتے تو: رسول کریم ﷺ (عبادت کے لیے) کمر بستہ ہوجاتے، راتوں کو جاگتے اور اپنے اہل وعیال کو بھی جگاتے۔''

آخری عشرے کی طاق راتوں میں شب قدر تلاش کیجیے

۱۰۔ تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِيْ الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ. [بخاری]

''رمضان کے آخری عشرے (دس دن) کی طاق راتوں میں، لیلۃ القدر کی تلاش کرو۔''

لیلۃ القدر میں مندرجہ ذیل مسنون دعا پڑھنا نہ بھولیے

۱۱۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ. [سنن ابن ماجہ]

''یا اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معاف کرنا پسند کرتا ہے، مجھے معاف فرمادے۔''

روزہ اور قرآنِ مجید کی شفاعت

۱۲۔ اَلصِّيَامُ وَالْقِيَامُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. يَقُوْلُ الصَّوْمُ: رَبِّ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ بِالنَّهَارِ، وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنَا فِيْهِ. [مسند احمد و سنن النسائی]

''روزہ اور قرآن بندے کے لیے قیامت کے دن سفارش کریں گے۔ روزہ کہے گا اے ربّ! میں نے اسے دن میں کھانے اور پینے سے روکا تھا اور قرآن کہے گا میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکا تھا تو اس کے حق میں ہماری سفارش قبول فرما۔''

فہم دین

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی [۱]

دینی جدوجہد اور تقسیمِ کار

مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس سلسلہ میں قدرت کے دو نظام ہیں،ایک جامعیت اور دوسرا تقسیمِ کار۔

جامعیت سے مراد یہ ہے کہ ایک ہستی یا ایک ہی شخص میں مختلف کاموں کو انجام دینے کی قدرت ہو اور تقسیم سے مراد یہ ہے کہ الگ الگ شخصیتوں اور چیزوں میں الگ الگ کاموں کو انجام دینے کی صلاحیت ہو۔جامعیت اصل میں اللہ تعالیٰ کا وصف ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر ایک پتہّ ہلتا ہے تو اس میں بھی اللہ کی مشیت کارفرما ہوتی ہے۔ہاتھی سے لے کر چیونٹی تک ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر کی پابند ہے۔مخلوقات میں ایسا کم ہوتا ہے کہ بیک وقت کئی صلاحیتیں جمع ہو جائیں لیکن اپنے بعض بندوں کو اللہ تعالیٰ متعدد صلاحیتوں کا حامل بنا دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا عمومی نظام تقسیم کا ہے۔مختلف چیزوں اور شخصیتوں میں الگ الگ صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔خود انسان کے وجود کو دیکھیے:مختلف اعضاء سے الگ الگ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں،دماغ سوچتا ہے،آنکھ دیکھتی ہے،ناک کا کام سونگھنا اور سانس لینا ہے،زبان مافی الضمیر کی ترجمانی کرتی ہے،پاؤں جسم کا بوجھ اُٹھا کر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے،ہاتھ کے ذریعہ چیزیں اپنی گرفت میں لی جاتی ہیں۔غرضیکہ ہر عضو کی الگ الگ صلاحیت ہے،الگ الگ کام ہے،الگ الگ وضع ہے۔ہر ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے،ان کے درمیان آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔

کائنات میں جو چیزیں ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی ہیں ان کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو آگ میں جلانے اور ٹھنڈا کرنے کی دُہری صلاحیت پیدا فرما دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔آگ جلانے کے کام آتی ہے اور پانی بجھانے کے۔پتھر کے ذریعہ مضبوط دیواریں تعمیر ہوتی ہیں اور مٹی کی نرم تہوں میں کھیت اگائے جاتے ہیں۔آم کے درخت سے جامن حاصل نہیں ہوتا اور جامن کے درخت میں انجیر کے پھل نہیں لگتے،صلاحیتوں کی تقسیم کا یہی نظام

---

[۱] بھارت کے معروف عالم دین

قریب قریب پوری کائنات میں کارفرما ہے اور یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم مصلحتوں پر مبنی ہے۔

دین کے بھی مختلف کام ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ عام طور پر انبیاء کو ایسی شانِ جامعیت سے نوازتے تھے کہ وہ بیک وقت تمام کاموں کو انجام دیتے تھے، خاص کر پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے اور پوری انسانیت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی حیات طیبہ اُسوۂ حسنہ ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہے کہ امت میں مختلف صلاحیتوں اور ذوق ومزاج کے لوگ ہوں گے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں جو جامعیت نظر آتی ہے، عام طور پر گزشتہ انبیاء کرام کی زندگیوں میں بھی اس درجہ کی جامعیت نظر نہیں آتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داعی بھی تھے، اس لیے آپ کو بشیر ونذیر اور داعی الی اللہ کہا گیا ہے (الاحزاب ۴۵، ۴۶)۔ تزکیہ واحسان بھی آپ کے ذمہ تھا (الجمعہ: ۲)۔ آپ مفتی بھی تھے (النساء ۱۲۷)۔ باہمی اختلافات کو طے کرنے والے قاضی بھی تھے (النساء ۶۵)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سپہ سالار اور مجاہد بھی تھے۔ اس پر سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاہد عادل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بہترین فرمانروا اور منتظم بھی تھے، پوری مدنی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ غرضیکہ دین کے تمام شعبے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں جمع تھے اور امت کے کارواں کو آگے بڑھنے کے لیے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت نہ صرف ان صلاحیتوں کی جامع تھی، بلکہ ہر میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اسوۂ لازوال ہے۔

نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگئی، لیکن کارِ نبوت باقی ہے اور یہ قیامت تک باقی رہے گا۔ اب یہ کام امت اور علماء کو انجام دینا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ [۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن جن امور کو انجام دیا کرتے تھے، اب امت کے افراد ان کو اپنی صلاحیت اور مزاج ومذاق کے اعتبار سے انفرادی واجتماعی طور پر انجام دیں گے۔ مگر بدقسمتی اور غلو کی بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی اکثریت صرف اپنے ذاتی مسائل ہی کو اپنا کام سمجھتی ہے اور دین کے کاموں اور مختلف شعبوں میں امت کی دشواریوں سے بے تعلق ہے لیکن جو لوگ اللہ کی توفیق سے دین کے مختلف شعبوں میں دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان میں بھی آج غلو کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ جو شخص جس شعبہ میں کام کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ کرنے کا صرف یہی ایک کام ہے۔

---

[۱] ابوداؤد، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۳۶۴۱

اسی سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی متعلق ہے، اس کے ذہن میں دوسرے کاموں سے متعلق تحقیر بیٹھ جاتی ہے اور جب کوئی کام انسان کو کمتر محسوس ہوتو جو لوگ اس کام کو کر رہے ہیں، ان کو بھی یہ اپنے مقابلہ میں کمتر خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ سوچ غلط بھی ہے، نقصان دہ بھی اور ملت کے اتحاد میں رکاوٹ بھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تمام صحابہ تمام کاموں کو انجام نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے مختلف رفقاء کے لیے ان کی صلاحیت اور ذوق ومزاج کے اعتبار سے کام مقرر کرتے تھے۔ انتظامی امور میں آپ زیادہ تر حضرت ابوبکرؓ سے مشورہ فرماتے تھے، قضاء اور انصاف کا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت معاذؓ اور بعض دیگر صحابہ کے سپرد کیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ابوعبیدہؓ اور مختلف صحابہ تھے جن کو فوجی مہمات سپرد کی گئیں، حضرت دحیہ کلبیؓ، حضرت عبداللہ بن حذافہؓ اور بعض صحابہ کرام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعوتِ اسلام کے لیے روانہ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ فرائض ومیراث کے مسائل میں زید بن ثابتؓ کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ فنِ قرأت میں حضرت ابی بن کعبؓ امتیازی درجہ پر فائز ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ میں تفقہ اور فہم قرآن کا خصوصی ملکہ تھا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ میں سے صرف ایک سوتیس صحابی تھے جن کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ وہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ بعض صحابہ کو تقریر وخطابت میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں نہایت مؤثر انداز میں اسلام کا تعارف کرایا، ایسا بھی ہوا کہ کوئی وفد خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں حاضر ہوا، اس کے خطیب نے تقریر کی تو اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی صحابی سے خطاب کرایا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ شعر وسخن کے ذریعہ اسلام کی نصرت وتائید فرمایا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی ان کی خدمت کو سراہتے تھے۔ یعنی مختلف صحابہ سے ان کی صلاحیت اور ان کے ذوق ومزاج کے مطابق کام لیا جاتا تھا اور ہر صحابی مفوضہ خدمت کو اس طرح انجام دیتے تھے کہ گویا یہی ان کی کوششوں کا محور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کی خدمت کو وقعت کی نظر سے بھی دیکھتے تھے، بلکہ ان کو احساس ہوتا تھا کہ ان کے ساتھی کا کام ان سے بڑھ کر ہے۔ وہ ایک دوسرے کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے اور ان کی خدمت کو اپنی خدمت پر فائق سمجھتے تھے۔

دین کا اصل مزاج یہی ہے، اگر کوئی شخص تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دے رہا ہے تو وہ بھی کارِ نبوت انجام دے رہا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معلم بھی تھے۔ اگر خانقاہوں میں تزکیہ کی تربیت کی جارہی ہے تو یہ بھی نبیوں والا کام ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم امت کے مربی بھی تھے۔ امامت وخطابت کی ذمہ داری جس کسی نے لے رکھی ہے وہ بھی نبیوں والا کام کر رہا ہے

کیونکہ انبیاء ہی اپنے اپنے عہد میں اس فریضہ کو انجام دیتے تھے۔ اگر کوئی شخص مسلمانوں میں دعوت دین کی خدمت انجام دیتا ہے اگر کوئی شخص برادرانِ وطن میں دعوت کا کام کررہا ہے تو یقیناً اس کی کوشش بھی کارِ نبوت ہے، کیونکہ انبیاء کا زیادہ تر خطاب اپنے زمانہ کی مشرک قوموں سے تھا۔ حلال وحرام کے بارے میں فتویٰ دینا اور مسلمانوں کے باہمی نزاعات کو حل کرنا بھی نبوت کی میراث میں شامل ہے۔ خدمتِ خلق بھی کارہائے نبوت میں داخل ہے اور مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کے لیے کام کرنا، اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینا، تصنیف وتالیف اور بحث وتحقیق بھی دین کی دعوت وتشریح میں شامل ہے کیونکہ یہ کام بھی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیادی ذمہ داریوں میں تھا (النحل: ۴۴)۔ موجودہ دور میں عصری تعلیم کے لیے درسگاہوں کا قیام تاکہ طلبہ عقیدہ وعمل کی حفاظت کے ساتھ جدید دور کے نافع علوم کو حاصل کریں، بھی ایک اہم دینی خدمت ہے اور موجودہ حالات میں بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

ایک شخص یا گروہ سے یہ امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ دین کے ان تمام شعبوں کو سنبھال لے گا۔ نہ ہر شخص میں ہر کام کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہر شخص کو ہر کام سے مناسبت ہوتی ہے، اس لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت، مزاج اور امت کی ضرورت کے لحاظ سے خدمت دین کے کسی ایک شعبہ کا انتخاب کرلے اور اسی میدان میں کام کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبوں کے ساتھ بھی تعاون کا جذبہ ہو اور کسی کام کو تحقیر اور کمتری کی نظر سے نہ دیکھا جائے، نیز جہاں تک ممکن ہو اس میں تعاون کیا جائے۔

اگر اس جذبے کے ساتھ مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں، جماعتیں، ادارے مل جل کر کام کریں تو ملت کی تمام ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، تعلیم کی بھی، دعوت وتبلیغ کی بھی، تزکیہ وتربیت کی بھی، سیاسی نمائندگی کی بھی، شرعی رہنمائی اور دفاع اسلام کی بھی، مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سیاسی نمائندگی کی بھی، اسی طرح ہر کام کو فروغ ہوگا اور ملت کی تمام ضرورتیں پوری ہوں گی۔ اتفاق واتحاد اور تعاون وتناصر کی فضا قائم ہوگی۔ ٹکراؤ، باہمی نفرت اور ناقدری کی صورت نہیں پیدا ہوگی کیونکہ جیسے انسان کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے مختلف صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے اسی طرح کسی قوم کو اپنے تحفظ وبقاء کے لیے مختلف سمتوں میں کام کرنے والے افراد اور گروہوں کی ضرورت پڑتی ہے، کاش، ملت کی ذمہ دار شخصیتیں، اداروں، جماعتوں اور تنظیموں کے نمائندے اس پہلو پر غور فرمائیں اور ان گزارشات کو قابل اعتناء سمجھیں۔

پاکستان مدیر

'سی پیک' کو 'ایسٹ انڈیا کمپنی' بنانے پر ہماری اسٹیبلشمنٹ کیوں راضی ہے؟

خوئے غلامی

امریکی غلامی سے نکلنے کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چینی غلامی کو کیوں خوش آمدید کہا جارہا ہے

وطن پارٹی کے سربراہ بیرسٹر ظفر اللہ خان نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی ہے کہ چینی باشندوں کو پاکستان میں ملکیتی بنیاد پر زمینیں خریدنے سے روکا جائے۔ انہوں نے اپنی درخواست میں کہا ہے کہ سی پیک منصوبے کی نرم شرائط ملکی مفادات کے خلاف ہیں۔ چینیوں کو پاکستان میں زمینوں، جائدادوں کی خریداری اور مالکانہ حقوق دینے سے نہ روکا گیا تو ملکی سالمیت کو خدشات لاحق ہوسکتے ہیں۔ انہوں نے عدالت عظمیٰ سے درخواست کی ہے کہ چینیوں کو پاکستان میں براہ راست سرمایہ کاری کی اجازت دینے کی بجائے پاکستانیوں کو کفیل مقرر کرنے کا حکم دیا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ میڈیا میں یہ باتیں بھی گردش کررہی ہیں کہ سارے ملک میں ہزاروں ایکڑ رقبے پر 'چائنا ٹاؤن' بنائے جارہے ہیں۔ گوادر میں چین کو فوجی اڈا بنانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں سرکاری اداروں میں چینی زبان سکھائی جارہی ہے۔ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ مستقبل قریب میں ایک کروڑ چینی پاکستان میں رہائش پذیر ہوں گے۔ بلوچستان کی مقامی آبادی اگلے چند سال میں اقلیت میں تبدیل ہوجائے گی جبکہ چینی باشندوں کی اکثریت ہوگی۔ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ چین پاکستان کو گرانٹ، بلا سود قرض یا سرمایہ کاری کی بنیاد پر پیسے نہیں دے رہا بلکہ سودی قرضوں کی صورت میں دے رہا ہے جو ہمیں مع سود واپس کرنے ہوں گے۔

سوال یہ ہے کہ ہماری اسٹیبلشمنٹ کو کیا ہوگیا ہے؟ ابھی ہم امریکی غلامی سے نکلے نہیں کہ چینی غلامی کا طوق ہم خوشی خوشی اپنے گلے میں ڈال رہے ہیں؟ کیا ہم 'سی پیک' کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجربہ دہرانا چاہتے ہیں؟ کیا دوسو سال کی غلامی ہماری نس نس میں اتنی سما گئی ہے اور خوئے غلامی ہم میں اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ ہمیں آزادی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور غلامی بوجھ نہیں لگتی؟ بقول منیر نیازی کے ایک پنجابی شعر کے (ترجمے کے) کہ ۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۵۰)

جمہوریت اور اسلامی نظام

ڈاکٹر انیس احمد اور پروفیسر طارق بٹ سے مکالمہ

ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن میں محترم پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد نے اشارات کے تحت جمہوریت مسلم دنیا اور تحریک اسلامی کے عنوان سے جو کچھ لکھا اور روزنامہ البرہان میں پروفیسر طارق بٹ صاحب نے جو تبصرہ فرمایا اُس سے یہ طالبعلم کنفیوز ہوا۔ ایک تو اشارات کے تحت لکھے گئے مضمون میں شاید اپنی کم علمی کی وجہ سے مجھے کوئی سر پیر نظر نہیں آیا۔ دوسرا محترم ڈاکٹر صاحب نے، بقول پروفیسر طارق بٹ کے، دو نتائج نکالے یعنی:

۱۔ مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے اور وہ اپنی بنیاد میں الحادی ہے اور مسلم معاشرے کے لیے موزوں اور قابل قبول نہیں ہے۔

۲۔ پاکستانی جمہوریت کرپشن، دھاندلی اور سرمایہ داری پر مبنی ہے اور مغرب زدہ مفاد پرست سیاسی طبقات کی لونڈی بنی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے کسی تعمیری اور اسلامی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ نتائج اگر درست بھی ہوں (اور شاید ہیں) تو جمہوریت کے اصل مفہوم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم نہ تو سیاستدان ہیں اور نہ ہی سیاسی علوم کے کبھی طالبعلم رہے ہیں، بس کامن سینس (Common Sense) کی روشنی میں جمہوریت کا جو مفہوم ہماری سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی "آزاد مرضی" سے اپنے نمائندے چنیں جو حکومت بنا کر ریاست کے اجتماعی معاملات بشمول عوام کی فلاح و بہبود اور ان کی زندگی میں امن و امان کو یقینی بنانے کے لئے کام کریں۔ دوسرے معنوں میں ایسی جمہوری حکومت قائم کریں جو عوام کے "اجتماعی ضمیر اور خواہشات" کی آئینہ دار ہو۔ ہمارے اوپر دیے گئے جمہوریت کے مفہوم میں "لوگوں کی آزاد مرضی" ''اجتماعی ضمیر'' اور'' خواہشات'' کلیدی الفاظ ہیں۔ اگر نمائندوں کے انتخاب میں "لوگوں کی آزاد مرضی" کارفرما ہو تو اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت جمہوری حکومت

نہیں کہلائے گی ۔ اسی طرح قائم ہونے والی جمہوری حکومت اگرعوام کے" اجتماعی ضمیر اور خواہشات" کی آئینہ دارنہیں ہوتی تو چاہے وہ حکومت لوگوں کی آزادمرضی سے ہی قائم کیوں نہ ہو وہ حکومت اپنے جمہوری فرائض ادا کرنے میں ناکام قرار دی جائے گی لہذا جمہوری حکومت نہ ہوگی ۔

یہاں یہ بھی عرض کیا جاتا ہے کہ'جمہوریت' حکومت بنانے کا ایک طریقہ ہے بذاتِ خود کوئی نظریہ نہیں ہے۔ جمہوریت میں نظریہ اُن کا کارفرما ہوگا جو جمہوری اختیار استعمال کرتے ہیں یعنی عوام، لہٰذا مطلق جمہوریت کسی سابقے کی سزاوار نہیں ہوتی ۔ ہاں اگر وہ جمہوریت مغرب میں ہے تو مغربی جمہوریت کہلائے گی اور اگر مشرق میں ہے تو مشرقی جمہوریت کہلائے گی ۔ بہ الفاظ دیگر اگر عام لوگ سیکولرزم، لبرلزم اور الحادی نظریہ کے ماننے والے ہوں گے تو اُن کی آزدانہ مرضی سے منتخب ہونے والے نمائندے اور ان نمائندوں کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت لبرل، سیکولر اور ملحد جمہوریت کہلائے گی ۔ اسی طرح اگر عام لوگوں کی غالب اکثریت عیسائی ہے تو اُن کی آزادمرضی سے قائم ہونے والی حکومت عیسائی جمہوریت کہلائے گی ۔ اگر عام لوگوں کی غالب اکثریت مسلمان ہے تو اُن کی آزادمرضی سے قائم ہونے والی حکومت مسلمان جمہوریت یا اسلامی جمہوریت کہلائے گی ۔ مذکورہ مسلمان جمہوریت یا اسلامی جمہوریت میں لوگوں کے اجتماعی ضمیر اور خواہشات کا تقاضہ ہوگا کہ حکومت اسلامی نظام زندگی کے مطابق جیسا کہ قرآن وسنت میں بیان کیا گیا ہے اپنا کاروبار چلائے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اسلامی حکومت یا اسلامی جمہوری حکومت نہیں ہے ۔ اس میں قصور جمہوریت کا نہیں، اسلامی جمہوری حکومت چلانے والوں کا ہوگا۔ پاکستان میں اگر نام نہاد جمہوری حکمران مغرب زدہ، لبرل، کرپٹ، جاگیردار اور بدنیت سرمایہ دار ہیں تو اس میں قصور جمہوریت کا نہیں بلکہ قصور اُس جمہور کا ہے جو خود بھی مغرب زدہ، لبرل اور کرپٹ ہیں اور اپنا نام نہاد جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے اپنے جیسے ہی مغرب زدہ، لبرل اور کرپٹ نمائندے منتخب کرتے ہیں جو اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنے اور چلانے کی بجائے مغرب زدہ لبرل اور کرپٹ حکومت چلاتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں کہیں مطلق جمہوریت ہے؟ جواب ہے کہ نہیں ہے۔

اس لئے نہیں کہ جمہوریت کی شرطِ اولیں یعنی" آزاد مرضی سے نمائندوں کا انتخاب" کہیں پوری نہیں ہوتی۔ وہ چاہے یورپ ہو یا امریکہ، چاہے ایران ہو یا پاکستان اور چاہے انڈیا ہو یا انڈونیشیا کہیں بھی لوگوں کو اپنی آزادمرضی سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ پہلی بات تو یہ کہ انتخاب کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے والے خواتین وحضرات اور منتخب کرنے والے عام لوگوں میں فاصلہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ آزاد فیصلے کی بنیاد ہی فراہم نہیں ہوتی۔ دوسرا جماعتی تعصب، شخصی محبت اور نفرت، مخالف اور موافق پراپیگنڈہ ، میڈیا کی جانبدرانہ ذہن سازی، دھن دھونس اور دھاندلی، برادری اور مسلکی تعلقات اور اکثر معاشرتی و سماجی مجبوریاں لوگوں کی آزادمرضی کے راستے کی بڑی رکاوٹیں ہیں۔لوگوں کی آزادمرضی سے اگر کوئی جمہوری حکومت قائم ہو بھی جائے تو بین الاقوامی دباؤ، عالمی معاہدے اور عالمی کمیونٹی میں زندہ رہنے کی مجبوریاں جمہوری حکومتوں کو عوام کے" اجتماعی ضمیر اور خواہشات" کے مطابق کام کرنے ہی نہیں دیتیں۔

پاکستان کا جمہوری نظام

پاکستان کے جمہوری نظام کی بنیاد پاکستان کا آئین ہے۔ پاکستان کے آئین میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ریاست کا مذہب اسلام ہے یعنی جو اکثریت کا مذہب ہے وہی ریاست کا مذہب بھی ہے۔انسان اللہ کا خلیفہ یا نائب ہے۔اس حیثیت میں پاکستانی مسلمان اللہ کی نیابت میں رہتے ہوئے اپنے اجتماعی معاملات آزادمرضی سے چنے ہوئے اپنے نمائندوں کے ذریعے چلائیں گے۔اگرچہ اللہ کو مقتدرِ اعلیٰ ماننے کے بعد جس کے نتیجے میں ملک میں کوئی قانون اللہ کی منشاء جس کا اظہار قرآنِ حکیم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوتا ہے، کے برعکس نہیں بن سکتا لیکن مزید برآں (More over) کے طور پر یہ بھی آئین میں طے کیا گیا ہے کہ ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کی تعلیمات کے برعکس نہیں بن سکتا۔

اوپر لکھے گئے سب کچھ کے بعد اگر پاکستان کے عوام جن کی بڑی غالب اکثریت مسلمان ہے، اپنی آزادمرضی سے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور یہ نمائندے نیابت الٰہی

کے تحت مسلمانانِ پاکستان کے اجتماعی ضمیر اور خواہشات کے مطابق اجتماعی معاملات چلانے کے لیے حکومت بناتے ہیں تو اس حکومت کو اسلامی جمہوری حکومت کہنے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔لیکن....اور یہ بہت بڑا لیکن ہے....کہ نہ تو نمائندوں کے انتخاب میں لوگوں کی آزاد مرضی شامل ہوتی ہے اور نہ ہی انتخابات کے نتیجے میں بننے والی حکومت عوام کے اجتماعی ضمیر اور خواہشات (جس کا اظہار آئین پاکستان میں ہوتا ہے) کے مطابق کام کرتی ہے۔قوانین پر عمل نہیں ہوتا۔قانون نافذ کرنے والے ادارے بدعمل، کرپٹ اور نااہل ہیں۔عدالتیں ظلم کے اڈے بن چکی ہیں۔انتظامی دفاتر عوام کو سہولتیں پہنچانے کی بجائے سہولت کاری میں رکاوٹیں کھڑی کرنے، ہراساں کر کے رشوتیں بٹورنے میں لگے ہوئے ہیں۔نہ جان و مال محفوظ ہے نہ عزت و آبرو۔حکومتی ادارے حق داروں کو حق دلانے کی بجائے حق فروشی کرتے ہیں۔ حکومتیں عوام کو آنکھیں دکھاتی ہیں اور لاٹھی بردار حکومتوں کو۔ہم پاکستان کی حکومت کو لاٹھی پیسے کی سرکار کہہ سکتے ہیں اسلامی جمہوری حکومت نہیں کہہ سکتے۔

دستور میں اسلامی جمہوری حکومت کا پورا میکانزم موجود ہے لیکن ہمارے قائدین کبھی اسلامی نظام کا مطالبہ کرتے ہیں تو کبھی نظام مصطفی اور خلفائے راشدین کے طرزِ حکومت کا۔کبھی اسلامی انقلاب کے نعرے لگائے جاتے ہیں تو کبھی تحفظ ختم نبوت کے۔دھرنے، ریلیاں اور کانفرنسیں ہیں کہ ختم ہونے میں نہیں آرہیں۔مرض واضح ہے کہ اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنے کے لیے منتخب نمائندوں کا انتخاب آزاد مرضی سے نہیں ہوتا اس لیے کہ عوام میں شعور و آگہی کی کمی ہے اور جن میں شعور و آگہی کا امکان ہے وہ مسلکی، حزبی، جماعتی اور برادری ازم کے تعصب میں اندھے ہیں۔اگر آزاد مرضی سے نمائندوں کے انتخاب کا امکان پیدا ہو بھی جائے تو اسلامی جمہوری حکومت قائم کرنے اور چلانے کے لیے رجالِ کار ہی نہیں ہیں، نہ اُن کے پاس جو اسلامی نظام اور نظام مصطفی کا نعرہ لگاتے ہیں اور نہ اُن کے پاس جو نام نہاد مغربی جمہوریت کے دلدادہ ہیں۔معاشرے کی اکائی فرد ہے، جب تک فرد اسلامی جمہوری ذہن کا حامل نہیں ہوتا تب تک اجتماعی سطح پر اسلامی نظام، نظام مصطفی اور اسلامی جمہوری حکومت ایک خواب ہی رہے گی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی انقلاب کے دلدادگان پہلے اسلامی

انقلاب لانے والے رجال کار پیدا کرنے کی طرف توجہ فرمائیں۔ضرورت ہے ایک متحرک اور مئوثر تعلیمی تحریک کی جو فرد کو بدلے جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرہ عرب کے جاہلوں، اجڈوں اور اللہ کے باغیوں کو بدلا اور صرف تیئیس سال کے مختصر عرصے میں زبردست اسلامی انقلاب برپا کر دیا۔ وسیلہ بنے قرآن اور صاحبِ قرآن۔ اب قرآن تو موجود ہے صاحبانِ قرآن موجود نہیں بلکہ مدرسین قرآن کا ایک جمگھٹا ہے جو درس قرآن کے نام پر اپنی لچھے دار تقریریں تو فرماتے ہیں لیکن قرآن کی تعلیم؟ ایک سوالیہ نشان بن چکی ہے۔کیا کوئی ہے جو اس طالب علم کی بات پر کان دھرے اور تعلیم وتدریس قرآن کی بنیاد پر رجال کار پیدا کرنے کی طرف توجہ دے تاکہ وطن عزیز میں حقیقی اسلامی جمہوری حکومت کا قیام ممکن ہو۔

بقیہ: خوئے غلامی

کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے
کچھ ہمیں مرنے کا شوق بھی تھا

کیا چین کا رویہ استعماری نہیں؟ ساری دنیا جانتی ہے کہ چین میں مسلمانوں کو بنیادی حقوق حاصل نہیں، مَردوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے اور عورتوں کو پردے کی اجازت نہیں۔ روزہ رکھنے اور حج پر جانے پر بھی پابندی ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کریں انہیں جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔جن مسلمانوں نے تنگ آ کر ہتھیار اٹھائے اور افغانی، پاکستانی طالبان سے مدد لینے کی کوشش کی انہیں پاک فوج کی مدد سے کچل دیا گیا۔سوال یہ ہے کہ ہماری سوچ اتنی سطحی اور غلامانہ کیوں ہے؟ سی پیک سے اگر چین کا مفاد وابستہ ہے کہ وہ گوادر کے ذریعے بحر ہند کے گرم پانیوں کی وساطت سے ساری دنیا سے تجارت کرنا چاہتا ہے تو ہمیں ہوشیاری سے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔اس کی بجائے ہماری خوئے غلامی اتنی مستحکم ہے کہ ہم چین کے آگے بچھے جارہے ہیں اور اس کی ساری شرطیں ہاتھ باندھ کر مانے جارہے ہیں! حاکمو! کچھ عقل کرو، کچھ شرم کرو، کچھ حیا کرو!

اسلام اور پاکستان پروفیسر طارق بٹ

انتخابات ۲۰۱۸ء
ان میں 'اسلام' کے لیے کچھ نہیں

ایک دوست نے ہم سے پوچھا کہ اگلے چند ماہ میں جو انتخابات ہونے والے ہیں کیا ان سے 'اسلام' کو کچھ فائدہ ہوگا؟ ہم نے کہا کہ ہمیں تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اس لیے کہ:

۱۔ مغرب نے مغرب زدہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے ذریعے مغربی جمہوریت اور مغربی طرز کے انتخابات کو جس طرح پاکستان میں رائج کر رکھا ہے اور پاکستان کے علماء کرام نے اسلام اور مغربی جمہوریت کو ملا کر 'اسلامی جمہوریت' کے نام پر جس طرح اس کو قبول کر رکھا ہے، اس سے اسلام برآمد ہونا ایسے ہی ہے جیسے بچوں کو محظوظ کرنے کے لیے جادوگر تماشہ دکھاتا ہے کہ جیب میں رومال ڈالتا ہے اور پھر کچھ دیر بعد اس جیب سے کبوتر برآمد ہو جاتا ہے۔

۲۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اگلے انتخابات میں وہ سیکولر سیاسی جماعتیں کامیاب ہوں گی (یعنی تحریک انصاف اور پیپلز پارٹی) جنہیں سیکولر عدلیہ اور فوج کی حمایت حاصل ہے (مغربی مفادات پس پردہ موجود ہیں) اور مسلم لیگ (ن) جو عدلیہ فوج گٹھ جوڑ کی مخالفت کر رہی ہے، وہ ناکام ہوگی۔ اس مخالفت کی وجہ بھی 'اسلام' نہیں ذاتی اور گروہی مفادات ہیں۔ لہٰذا ہماری بلا سے جو بھی جیتے، ہمیں کیا؟ جو بھی جیتے گا وہ سیکولر ہوگا اور سیکولر قوتوں کی حمایت سے جیتے گا۔ بلاشبہ عمران خان اور زرداری میں فرق ہے لیکن یہ فرق انیس بیس کا نہیں تو اٹھارہ بیس کا ہوگا اور نظریاتی لحاظ سے اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

۳۔ جہاں تک دینی سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے تو ان کا غیر موثر اور ناکام ہونا اظہر من الشمّس ہے۔ مغرب نے ان میں تفرقے اور فرقہ واریت کا جو بیج بویا تھا، اور جس کا انہیں احساس ہی نہیں، وہ اب قد آور درخت بن چکا ہے۔ بلاشبہ ان کے کچھ 'اتحاد' بھی وجود میں آ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور فرقہ واریت کا جنّ کھلے عام ناچ رہا ہے جس کا مظہر یہ ہے کہ ایم ایم اے کے اتحاد میں ایک بڑا دیوبندی گروپ موجود ہے تو مولانا سمیع الحق کا گروپ اس سے باہر ہے۔ اہل حدیثوں کا ایک بڑا گروپ (ساجد میر)

ایم ایم اے میں ہے تو دوسرے بہت سے گروپ باہر ہیں۔ بریلوی بھائیوں کا ایک چھوٹا سا گروپ ایم ایم اے میں ہے تو دوسرے سارے گروپ ایم ایم اے سے باہر ہیں۔ جو گروپ باہر ہیں وہ مل کر ایم ایم کے بالمقابل ایک اور 'اتحاد' بنا رہے ہیں۔ پھر 'فرشتوں' کی حمایت سے دو نئی سیاسی جماعتیں منصۂ شہود پر آئی ہیں اور دونوں فرقہ واریت میں متشدد ہیں، بریلوی بھائیوں کی 'تحریک لبیک' اور اہل حدیث بھائیوں کی 'ملی مسلم لیگ'۔ دونوں چونکہ تازہ دم اور نو عمر ہیں اس لیے فعال، متحرک اور موثر ہیں۔ جو بات صاف نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب 'دینی سیاسی جماعتوں' اور اتحادوں میں باہم اور سیکولر سیاسی جماعتوں سے گھمسان کا رن پڑے گا۔ جس میں موثر دینی گروپوں/ جماعتوں کو دو دو چار چار نشستیں ملنے کا امکان ہے جن کا غیر موثر ہونا ظاہر و باہر ہے۔ فرض کیجیے ایم ایم اے، خیبر پی کے میں جیت بھی جاتا ہے تو پہلے انہوں نے اسلام کے حق میں کیا کارگردی دکھائی تھی جواب دکھا لیں گے؟ نہ ان کے پاس کوئی وژن ہے، نہ رجال کار اور نہ حکمت عملی۔ بس اسلام کا نعرہ ہے لیکن نعرے سے کس کا پیٹ بھر سکتا ہے، سوائے لیڈروں کے؟

۴۔ ہم نے سطور بالا میں جو تجزیہ 'دینی سیاسی جماعتوں اور اتحادوں' کا کیا ہے، وہ نہ مایوسی کا مظہر ہے اور نہ منفی سوچ کا، یہ زمینی حقائق پر مبنی ہے۔ وہ دینی سیاسی جماعتیں جو کبھی اسلامی انقلاب، اسلامی نظام زندگی، غلبۂ اسلام اور نظامِ مصطفیٰ و نفاذِ شریعت کا نعرہ لے کر اٹھی تھیں، اب تحفظ اسلام پر آ گئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے دین کا تحفظ بھی نہیں ہو پا رہا اور فرد، معاشرہ اور ریاست دن بدن دین سے ہو رہے ہیں۔ آئین وقوانین میں اور عدلیہ وانتظامیہ کے فیصلوں میں بے دینی کے اثرات دن بدن بڑھ رہے ہیں اور جن کا توڑ دینی سیاسی قوتیں کر نہیں پا رہیں۔

پس چہ باید کرد؟

سوال یہ ہے کہ کیا دینی سیاسی جماعتیں پاکستان میں کامیاب ہو سکتی ہیں؟ ہماری رائے میں یہ ممکن ہے اگر وہ مندرجہ ذیل بنیادی تقاضے پورے کریں:

۱۔ دینی اور دعوتی قوتوں کی اصلاح ہو اور وہ جدید تعلیم، دینی تعلیم، ذرائع ابلاغ، دعوت، تربیت وتزکیہ کے ذریعے معاشرے میں 'انسان سازی' کا کام بڑے پیمانے پر کریں

اور فرد کو حقیقی دین سے وابستہ کر کے اس کے اندر تبدیلی لائیں۔

۲۔ دینی سیاسی جماعتیں فرقہ واریت سے بالاتر ہو جائیں۔

۳۔ وہ غلبۂ دین کے ایک پروگرام پر متفق و متحد ہو کر جدوجہد کریں۔

۴۔ وہ موجودہ 'مغربی جمہوریت' (بشکل 'اسلامی جمہوریت) کو قبول کر کے اس کے اندر رہتے ہوئے مطمئن ہو کر اس میں کام نہ کریں اور اس کا حصہ نہ بن جائیں بلکہ پریشر گروپ کے طور پر کام کر کے اس میں ضروری تبدیلیاں کرائیں تاکہ اس میں ان کے آگے بڑھنے کے راستے بند نہ ہوں۔

ان چار باتوں پر عمل کر کے دینی سیاسی جماعتیں کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے چونکہ ان چار اصولوں پر عمل ممکن نظر نہیں آتا لہٰذا دینی سیاست کے نام پر ہونے والا تماشہ یوں ہی چلتا رہے گا اور 'دینی قائدین' اس سے متمتع ہوتے رہیں گے خواہ اسلام اور مسلمانوں کا اس سے بھلا ہو یا نہ ہو!

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِ اعانت سالانہ 500 روپے تاحیات 6000 روپے

نام..

پتہ..

فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

اسلام اور پاکستان

پروفیسر ملک محمد حسین

دینی سیاسی جدوجہد کا صحیح طریقِ کار

پاکستان میں معاشرہ جن حلقوں میں تقسیم ہے ان میں بودوباش کے لحاظ سے ایک شہری/قصباتی حلقہ ہے اور دوسرا دیہاتی حلقہ۔ نظریاتی تقسیم کے لحاظ سے ایک طبقہ لبرل/سیکولر لوگوں کا ہے تو دوسرا مذہبی حلقہ۔ مذہبی حلقہ میں دو بڑے گروہ ہیں ایک سُنی اور ایک شیعہ۔ مزید یہ کہ سُنی حلقہ میں غالب تعداد بریلوی مکتب فکر کی ہے اس کے بعد دیوبندی مکتب فکر کے حامل لوگ ہیں اور پھر سلفی یا اہل حدیث مسلک کے لوگ۔ سیاسی طور پر معاشرے کا کنٹرول گاؤں سے شروع ہوتا ہے اور یونین کونسل سے ہوتا ہوا ضلع کونسل، ایم پی اے کا حلقہ اور ایم این اے کا حلقہ سے سیاسی جماعت کے اثر ورسوخ پر ختم ہوتا ہے۔ محدود اور توسیع یافتہ برادریاں بھی اپنا رول ادا کرتی ہیں۔ دیہاتی سطح پر سیاسی اثر ورسوخ کا یونٹ گاؤں ہے اور شہروں میں محلہ/وارڈ کی حیثیت ہوتی ہے۔ سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرنے اور الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے شہروں اور دیہاتوں میں سیاسی یونٹوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت ان سیاسی یونٹوں میں اپنے سیاسی اثر کو مضبوط کر لیتی ہے تو درجہ بدرجہ اوپر کے بڑے یونٹوں یعنی ضلع کونسل کا چیئرمین، ایم پی اے اور ایم این اے کی سطح پر اپنا اثر دکھا سکتی ہے۔

قطع نظر دوسری سیاسی جماعتوں کے ایک ایسی دینی جماعت جو مسلک اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو (جیسا کہ جماعت اسلامی ہے) اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاسی اثر ورسوخ کے سب سے نچلے یونٹ پر توجہ دے۔ اس توجہ میں جماعتی نعرہ بازی کم اور عوامی خدمت پر زور زیادہ ہو اور جب کوئی شخصیت مقامی معاشرے میں نمایاں ہو جائے تو اسے لوکل انتخابات میں سامنے لایا جائے۔ اس طرح آہستہ آہستہ لوکل سطح کی قیادت جب قبضہ میں آجائے تو اوپر کی سطحوں پر نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر فوری طور پر نمائندگی نہ بھی ملے تو قومی اور صوبائی حلقوں میں منتخب نمائندوں پر اثر ورسوخ قائم کیا جائے۔ اس لائحہ عمل پر تسلسل کے ساتھ عمل کیا جائے تو دیرپا سیاسی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور قومی و مقامی فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

دریچے نقیبِ سحر

پڑھتا جا شرماتا جا

ا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون. روزنامہ دنیا مؤرخہ 8 مئی 2018ء میں خبر چھپی ہے کہ نائب تحصیلدار شاہ پور نے انٹرمیڈیٹ امتحان کے مقامی سنٹر کا معائنہ کیا۔ جی ہاں 12 ویں سکیل کے اہل کار نے جس کے عہدے کے ساتھ رشوت، بدعنوانی اور غریب کاشتکاروں کو چوس کھانے کا امیج ازل سے چپکا ہوا ہے۔ محکمہ تعلیم کے کم از کم سترھویں سکیل کے افسر کی زیر نگرانی چلنے والے امتحانی سنٹر کو چیک کیا کہ کہیں محکمہ تعلیم کا وہ سینئر استاد ڈیوٹی پر موجود دیگر اساتذہ کے ساتھ مل کر انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کو نقل تو نہیں کروا رہا۔ حکمرانوں کے لیے تو شاید یہ حادثہ ایک عمومی انتظامی عمل ہو لیکن اساتذہ کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ استاد کی دیانت، امانت اور فرائض منصبی کی ادائیگی کا معیار اب اتنا گر چکا کہ نائب تحصیلداروں کو اُن کی پڑتال کرنا پڑ رہی ہے۔ لیکن بقول شخصے یہ تو ہونا ہی تھا کہ جب پورے صوبے کے گریڈ 20 تک ہزاروں اساتذہ، پروفیسرز اور پرنسپلز امتحانی بورڈوں کی چیئرمینی کے اہل نہیں ٹھہرے اور ان امتحانی بورڈوں کو ڈویژنل کمشنر کے حوالے کرنا پڑا تو ڈویژنل کمشنر جو حقیقتاً ڈویژن کا چیف پٹواری ہوتا ہے تو اس کے لیے تو قابلِ اعتبار شخص نائب تحصیلدار ہی ہوسکتا ہے جو ایک سب تحصیل میں پٹواریوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اب تحصیلداروں کو ہیڈ ماسٹر، نائب تحصیل داروں کو سکینڈ ہیڈ ماسٹر اور معزز پٹواری صاحبان کو قوم کا مربی یعنی ٹیچر لگا دیا جائے۔ ویسے بھی ان محکمۂ مال کے عہدیداروں کا کام 2 بجے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے اور رات گئے تک جاری رہتا ہے تو کیوں نہ وہ 2 بجے سے پہلے تدریسی کام سنبھالیں اور قوم کو کرپشن فری بنانے کا اہتمام کریں۔

پہلے تو اس طرح کی حماقتوں پر اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیمیں سینہ تان کر کھڑی ہو جایا کرتی تھیں لیکن اب ہر طرف سناٹا ہے۔ اس سناٹے میں حافظ وحید اللہ خان، پروفیسر افضل علوی، عبدالغفور غفاری، محمد اشرف رندھاوا، پروفیسر انیتہ غلام علی، رانا عبدالحئ، چوہدری محمد اسلم وغیرہ کی روحیں تڑپ تڑپ کر آسمان کی طرف پلٹتی ہوں گی اور زندوں میں رانا اصغر علی، حاجی محمود

اختر، پروفیسر اسلم اُپل، طارق محمود وغیرہ تارے گنتے راتیں گزارتے ہوں گے کے بے بسی نے اُن کے وارثوں کے ہاں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

۲۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہماری بہنیں اور بیٹیاں بسوں میں کنڈکٹر بنیں، آوارہ نظروں کا ہدف اور حریص نگاہوں کا نشانہ بنیں مگر ہم اپنے سیاسی مفاد میں الجھ کر اسلامی نظام، نظامِ مصطفی اور لبیک یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نعرے لگاتے رہے، ریلیاں نکالتے رہے، دھرنے دیتے رہے اور کانفرنسوں میں گلے پھاڑتے رہے۔ ادھر شیطان کے چیلے ننگا ناچ ناچتے رہے اور ادھر رحمن کے" غلام" مذہبی اور سیاسی فرقہ واریت میں مبتلا اللہ کے دین کو بازیچۂ اطفال بناتے رہے اور شر کے خلاف مزاحمت کا میدان خالی چھوڑ دیا۔

۳۔ مادر پدر آزاد این جی اوز کی اباحیت پسند خواتین نے" میرا جسم میری مرضی" کے نعرہ کے تحت ریلیاں منعقد کیں، مرد و زن کی مرضی سے جسمانی اختلاط کے تحت واقع ہونے والے زنا کو جائز قرار دینے کے حق میں آواز بلند کی۔ اقوام متحدہ کی اس سلسلہ میں رپورٹ کو مسترد کرنے کی بجائے وزارتِ خارجہ نے Noted لکھ کر غور کرنے کا عندیہ دیا۔ گویا اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت کا اس طرح کے غیر اسلامی اور غیر اخلاقی معاملات میں مخالفت چھوڑ کر خاموشی اختیار کرنے اور غور کرنے کا عندیہ دینا اور ملک کی اسلامی قوتوں، دینی گروہوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں کا مجرمانہ صرفِ نظر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہو گیا اور ہم اتحادوں کی سیاست، انتخابات میں رُسوا ہونے کے پروگرام اور کرپشن کے خلاف اُچھل کود میں مصروف رہے۔ ہم میں سے بعض دفاع پاکستان کے نام پر ڈرامے کرتے رہے اور بعض استحکامِ پاکستان کی آنکھ مچولی میں مصروف رہے۔ یہ نہ دیکھا کہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور ہم قیامت کے انتظار میں محوِ خواب ہیں۔

۴۔ ٹی وی چینلوں پر فحاشی عریانی ننگا ناچ رہی ہے۔ مذہبی پروگراموں کے کمرشل وقفوں میں بھی یہ ناچ جاری رہتا ہے۔ خبر نامہ کو اسی قسم کے ناچ سے اور انڈین گانوں کے بولوں سے دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ جنسی بھوک بڑھانے اور نوجوان ذہنوں میں جنسی بے راہ روی کے فروغ کے لئے الیکٹرانک میڈیا کا ایک ایک لمحہ صرف ہوتا ہے اور پرنٹ میڈیا کا ہر صفحہ اور ہر کالم اس گندگی کو بڑھانے میں لگا ہوا ہے لیکن" ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے

نام نہاد غلام بھی سرخی غازہ لگا کر اور اپنی ریش مبارک کو خوشبو دار تیل سے معطر کر کے شعارِ دین کی بے حرمتی کے لئے میڈیا پر اپنی رونمائی اور پبلسٹی کے لیے پہنچے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو ہمارے پاس جواز ہے کہ ہم کوئی میدان بھی مکمل طور پر دوسروں کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں چاہے وہ میدان فحاشی اور بے حیائی سے آلودہ ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ تعلیمی ادارے جنسی آزادی، مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے اڈے بن گئے ہیں۔ نوجوان نسل کو نیم عریاں خواتین اساتذہ سے پڑھوا کر انہیں بچپن سے ہی جنسی حرص میں مبتلا کر رہے ہیں بقول ایک واقف حال کے تعلیمی اداروں کے جھرمٹ میں واقع فلیٹس ''مل کر اکھٹے رہنے'' کے مقاماتِ آہ وفغاں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تنہا لڑکیوں کا ہاسٹل کامیاب نہیں ہوتا جب تک پڑوس میں لڑکوں کا ہاسٹل نہ ہو۔ رائے ونڈ روڈ لاہور کے اردگرد کے علاقے میں شراب اور کچے پکے گوشت کی ڈیمانڈ اور Consumption بہت بڑھ گئی ہے۔ ''اپنا جسم اپنی مرضی'' کا مکمل راج ہے۔ رائے ونڈ روڈ کے اردگرد واقع اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے مذہبی ذہن کے مالکان اور معلمین سب کچھ جانتے ہیں، کانوں کو ہاتھ بھی لگاتے ہیں لیکن مال و زر اکٹھا کرنے کی خوشی میں بس صرف کانوں کو ہی ہاتھ لگاتے ہیں زبان نہیں ہلاتے۔ یہ سب کچھ سب کے دیکھتے ہو رہا ہے۔

۶۔ عدالتیں ظلم و ستم کے اڈے بن چکی ہیں۔ منصف شاداں ہیں کہ اُن کی نوکری قائم ہے۔ وکیل فرحاں ہیں کہ انہیں ستم رسیدہ گاہک میسر ہیں۔ اور ستم رسیدہ مدعیان اور مدعا الیہ سر نیہوڑائے ہر روز آٹھ بجے عدالتوں کی راہداریوں میں آ بیٹھتے ہیں۔ شام تین بجے اگلی تاریخ لے کر اور وکیلوں اور ان کے منشیوں کے ہاتھوں جیب کٹوا کر بھوکے پیاسے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ تعلیمی ادارے جہالت کے جزیرے اور مغربی تہذیب وتمدن کے تاریک پہلوؤں کو فروغ دینے کے ایجنٹ بن چکے ہیں۔ سرکاری دفاتر بدمعاشوں کی کمین گاہیں، رشوت کی ایجنسیاں اور کچھ نہ کرنے کی آرام گاہوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ قوم کو کرپشن کے ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔ عوام حیران ہیں کہ کرپشن کی یہ شہزادی کب قابو میں آئے گی تاکہ اُن کی بھی کبھی شنوائی ہو۔

۷۔ سابق محافظِ اعلیٰ پاکستان جو تاریخ کے جبر کی وجہ سے سابق صدر پاکستان بھی ہیں یعنی افواجِ پاکستان کے سابق سربراہ جنرل پرویز مشرف نے 'سب سے پہلے پاکستان' کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ڈالروں کے عوض چار ہزار پاکستانی غیروں کے ہاتھ فروخت کیے۔ یہ خبر کسی ایرے غیرے نتھو خیرے نے نہیں اُڑائی بلکہ نیب کے سربراہ اور گم شدہ افراد کے کمیشن کے چیئرمین جسٹس (ر) جاوید اقبال نے پارلیمنٹ کے ایک ذمہ دار فورم پر سنائی۔ ہمارے اس جی دار ''محافظ اعلیٰ'' نے بزبان خود بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد سعودی بادشاہ نے اُسے ایک ارب روپے بطورِ انعام مرحمت فرمایا۔ کس خدمت کے عوض؟ یہ شاید صرف موصوف کو ہی معلوم ہے۔ اس عظیم ملک نے کیسے کیسے سپوت پیدا کیے، انہں عزت سے نوازا اور جب وہ اپنی افرادی اور اسلحی طاقت سے اس ملک پر قابض ہوئے تو انہوں نے کیا کیا گُل کھلائے؟ اس کی خبر ہمارے سابق ''محافظ اعلیٰ'' کی گل افشانیوں سے مل رہی ہے۔ پھر بھی ہم پورے دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ہم عظیم قوم ہیں۔ ہمارے ادارے عظیم ہیں اور ان اداروں کے سربراہ تو عظیم ترین ہیں جو 'سب سے پہلے پاکستان' کا نعرہ لگا کر انہیں ڈالروں کے عوض بیچ دیتے ہیں جن کی حفاظت اُن کے ذمہ ہوتی ہے۔

واہ رے زمانے تو نے جو کچھ بھی دکھایا ہم نے سرنگوں ہو کر دیکھا، اُن کے گن بھی گائے جنہوں نے ہمیں ذلیل کیا اور اُن کے پاؤں تلے آنکھیں بھی بچھائیں جنہوں نے ہماری عزت و وقار کو پامال کیا اور دنیا بھر میں ہماری شناخت کو رُسوا کیا۔

بقول شورش کاشمیری ؎

اے مری قوم ترے حسنِ کمالات کی خیر
تو نے جو کچھ بھی دکھایا وہی نقشہ دیکھا